تاجور سامری

جب بندھن ٹوٹے

ایک رپورتاژ

ادبی مندر پبلشرز

چھپوانے اور شائع کرنے کے حق
تاجور سامری کے نام محفوظ ہیں

قیمت ——— تین روپے

ادبی مندر پبلشرز
دہلی ——— جالندھر

کیا مذہب تہذیبی یگانگت کی روح پیدا کر سکتا ہے؟ ان سوالوں کا جواب ہر شخص مختلف دے گا تاجور سامری کے خیال میں یہ مسئلہ بہت گہرا ہے۔ اور محض ظاہری ہمدردیوں اور مذہبی یکجہتی سے حل نہیں ہو سکتا۔ یگانگت کی روح کہیں اور بستی ہے۔ جب تاجور سامری کا قافلہ پنجاب کے دیہاتی مسلمانوں کے گاؤں سے گذر رہا تھا تو کیا وہاں کے مسلمانوں کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے؟ ——— شرم اور رنج کے آنسو ——— کہ ان کے ہم وطن بعض سیاسی جانبازیوں کی وجہ سے ان کا ساتھ چھوڑ کر جانے پر مجبور ہیں؟

سامری کا مشاہدہ بھی گہرا ہے۔ انھوں نے ان نفسیاتی پہلوؤں کو بھی دیکھا ہے جو بدلے ہوئے حالات میں ابھر کر نمایاں ہو گئے تھے۔ اس رپورتاژ کو پڑھ کر آپ محسوس کرینگے کہ حالات نے اچھے خاصے لوگوں کو کس قدر خود غرض اور حریص بنا دیا ہے۔ سب کچھ کھوئے ہوئے لوگ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے لڑتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے سامان کے لئے بے چین ہیں۔ ایک اجتماعی احساس کے باوجود پریشان ہیں۔ کیونکہ انہیں معلوم نہیں کہ جس نئے دیس میں وہ جا رہے ہیں وہاں ان کا کیا حال ہوگا! یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ محض ہم مذہب ہونا تنہائی اور بربادی، بے اطمینانی اور خانہ ویرانی کے احساس کو مٹا سکتا ہے؟ اور جواب وہی ہے ہرگز نہیں! جب ہندوؤں اور سکھوں کا قافلہ ہندوستان زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا پاکستان کی سرحد پار کر کے آزاد ہندوستان میں آگیا تو اس کا دل اور بجھ گیا۔ کیونکہ یہاں جس جنت کی جستجو میں آیا تھا وہ نہیں تھی ——— اور کیسے ہو، ہندوستان اور پاکستان آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ یہاں اب بھی عوام کا تقریباً وہی حال تھا۔ برطانوی سامراج کے زمانہ میں تھا۔

اس تعارف میں ان تمام خوشیوں اور غموں، سوالوں اور مسئلوں کا ذکر نہیں ہو سکتا

آتے ہیں۔ چوہے اور بلیاں دندناتی دکھائی دیتی ہیں۔

تاجور سامری نے بیچ میں لقمہ دیتے ہوئے کہا! اور ہنومان مندر کے پجاری جی نے دیوتاؤں کے زیور اور مکٹ اُتار کر چاندی سونے کو گلا کر بیچ دیا ہے۔ اب بھی آپ بھگوان بھگوان کی رٹ لگائے جاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں! چاچا! اب بھی وقت ہے ہم عقل سے کام لیں،

چاچا دھیرے سے بولے۔ اب پھر تم ہی کہو کیا قدم اٹھایا جائے۔

تاجور سامری نے کہا۔ کیمپ بساؤ چلکر اور کیا قدم اٹھاؤ گے؟

چاچی گھبرا کر بولیں۔ تو ہم کو اپنے گھر بار سامان چیز بست سب کچھ چھوڑ کر جانا پڑیگا۔

تاجور سامری نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ہاں سبھی کچھ!

سب حیرت اور افسوس کے سمندر میں غرق ہوگئے۔ اتنے میں گلی میں کچھ شور سنائی دیا۔ سب کھڑکیوں سے جھانکنے لگے،

گلی کے چوک میں پیراشوٹ بلوچی فوجی مندر کے سامنے کے حلوائی جے رام کو گھیرے میں لئے اسے مار پیٹ کر رہے تھے۔ ایک سپاہی کہہ رہا تھا۔ شیطان سلام نہیں کرتا تھا! کیوں نہیں کرتا سلام؟ تمہارے باوا کا راج ہے؟ سالے گولی مار دونگا۔ اور جے رام گڑگڑا رہا تھا۔ ہاتھ باندھ کر کہہ رہا تھا، میرے مائی باپ مجھ سے خطا ہوئی۔ معافی دو۔ اب کی! سوار سلام کرتا ہوں،

دوسرا فوجی قہقہہ مار کر بولا، اب آیا سالا راہ پر، کافروں کی ہیکڑی بھلا دیجائیگی۔

——— اچھا جا او کافر! پچاس روپے لیکر آ تب چھوٹے گی جان۔

جے رام بولا۔ پچاس روپے کہاں ہیں سرکار! اب تو پیسے کا بھی کال نہیں۔

"تم سب کافر یہی کہتے ہو۔ میں نہیں مان سکتا کہ تمہارے پاس بالکل کچھ نہیں۔ نکال نکال

کمبخت ورنہ مارتا ہوں گولی"۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی رائفل کی سنگین اسکے سینے پر رکھ دی۔ جیرام نے خوفزدہ ہوکر انٹی سے دس دس کے دو نوٹ نکالے اور اُس سپاہی کو دیکر کہا۔ سرکار یہی ہے میرے پاس اور کچھ نہیں۔

اچھا جا، موج کر۔ یہ کہہ اس سپاہی نے روپے لیکر اسے گلی کی طرف دھکیل دیا۔ پیراشوٹ کے فوجی ہنستے قہقہے مارتے بازار کو نکل گئے اور ساری گلی میں ایک دہشت چھا گئی۔ مندر کی کھڑکیوں اور دوسرے بالاخانوں کی کھڑکیوں سے جھانکتے عورت مرد خوف اور افسردگی سے دھندلا گئے۔ گائیں اور بھینسیں ایک ڈرے ہوئے انداز میں کان کھڑے کئے۔ دُمیں اٹھائے اور آنکھوں میں ایک خوفناک وحشت لئے بازار کی طرف پھنکار پھنکار کر دیکھ رہی تھیں۔

آج تاجور سامری بہت اُداس تھا۔ اس کے پیارے دوست اور استاد بھائی پنڈت سریندر موہن دتاتریہ اپنے گھر کا سب کچھ اپنے ہاتھوں لٹا کر خالی ہاتھ ہندوستان چلے گئے۔ سوڈھی ہردیال سنگھ اس سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ اور آج جب وہ اپنے استادِ محترم علامہ کیفی کا پیغام پاکر پولیس لائن کے سامنے کرشن بھون پہنچا تو وہاں سے بھی مایوس ہوا کیونکہ وہ انتظار کر کے اکیلے ہی ہوائی جہاز سے بمبئی کو چل دیئے تھے۔ کرشن بھون والوں میں سے بھی کوئی نہیں تھا۔ آسکو میوزم والے عبدالرحمان اسکوٹی پر قابض تھے۔ پاکستان کا سبز، چاند تارے والا جھنڈا وہاں لہرا رہا تھا۔ یہ بات تاجور سامری کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پنڈت تربھون کرشن پاکستانی حکومت کی وفاداری کا عہد لینے کے باوجود کیوں ہندوستان بھاگ گئے۔ وہ اپنی خیالوں میں چینوٹ بازار کے اس حصے میں پہنچا جہاں اسکے دوست مسٹر شانتی ناتھ کا مکان تھا۔ وہ اس مکان کے بڑے سے دروازے کے آگے جاکر رُکا ہی تھا۔ مسٹر

مختار نے آکر کہا، شانتی ناتھ اور اس کے ماں باپ کو میں آج ہی گاڑی میں سوار کر کے آیا ہوں یہ سنکر تاجور سامری کو ایک گہری ویرانگی کا احساس ہونے لگا۔ وہ چپکے سے آگے بڑھ گیا۔ وہ سوچتا چلا جا رہا تھا، تو کیا اب اسے بھی اپنے عزیز وطن کو چھوڑنا پڑے گا۔ دنیا کے ہر شہر سے خوبصورت لائلپور کو کس طرح چھوڑے گا۔ اچانک کسی نے پکارا، "تاجور۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پکارنے والے خلیق قریشی تھے۔ بہت دنوں بعد آج انہیں دیکھا لیکن ہیں! آج ان کے چہرے پر خوشی کیوں نہیں! حالانکہ وہ بڑے کٹر پاکستانی تھے۔

خلیق صاحب پاس آگئے اور غمگین لہجے میں بولے۔ "تاجور تم کہاں تھے اتنے دنوں سے! میں ڈر کے مارے تمہاری گلی میں نہیں آ سکا۔ لیکن بخدا سچ کہتا ہوں اور کئی جگہ پھرا ہوں! تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا۔

تاجور سامری نے طنزاً کہا۔ اب بھی کوئی ڈرنے کی وجہ ہو سکتی ہے خلیق صاحب!

خلیق روتے ہوئے بولے، تم نے مجھے غلط سمجھا ظالم! میں مسلم لیگی ضرور ہوں پاکستان کا کٹر حامی، لیکن کچھ اور بھی ہوں۔ ایک انسان، ایک دوست رکھنے والا آدمی، تاجور یقین مانو میں نے ایسا پاکستان کبھی نہیں چاہا تھا، جس میں میرے دوست نہ ہوں، میرے پیارے ہندو دوست، انسان کی پرائیویٹ جائداد ہے۔ اور کسی کو اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا لیکن افسوس آج مجھ سے میری جائداد چھینی جا رہی ہے۔ آج علامہ حضرت، چلے گئے۔ پنڈت تربھون کرشن چھوڑ گئے۔ بابو جگت رام لوتھرا چلے گئے۔ اور تو اور پاکستان کے سب سے زیادہ وفادار شہری ہونیکے دعویدار دولت رام سہگل اور ان کے لڑکے کلدیپ چند سہگل بھی اپنے پریس لو جلا کر چلے گئے۔ شہر سونا ہو گیا ہے۔ میں دیوانہ ہو گیا ہوں اپنے اجڑے ہوئے وطن کی ویرانیوں پر روتا ہوں اپنے دوستوں کے قتل ہو جانے پر روتا ہوا ان قاتلوں کو ڈھونڈتا ہوں

لیکن کوئی چھرا، کوئی برچھا میرے لئے نہیں۔

تاجور سامری کا جی بھی بھر آیا اور بولا، خلیق بھائی، ہم مجبور ہیں ہمارے لیڈروں نے ہماری جہالت اور عقیدت سے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔

تم کیا کہہ رہے ہو، تاجور! اس کا مطلب ہے تم بھی جا رہے ہو۔ تم بھی میرے دل پر ایک اور چرکا لگا رہے ہو۔

تاجور سامری۔ مجبوراً مجھے بھی جانا پڑ رہا ہے۔

خلیق۔ آخر کیوں۔ تمہیں کیا مجبوری ہے تاجور۔ مذہب کو تم نہیں مانتے۔ مندر و مسجد کا تم احترام نہیں کرتے، تمہیں کیا ڈر مسلمان ہوئے تو کیا، ہندو ہوئے تو کیا!

کچھ بھی ہو خلیق بھائی۔ میں یہاں رہ کر محفوظ نہیں مجھے ہندو سمجھا جائیگا۔ ہو سکتا ہے تمہارا جوش اسلامی ہی مجھے ختم کر دے۔ تاجور سامری نے رکتے رکتے کہا،

خلیق، ظالم یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میں سب کچھ سہی۔ لیکن بربر نہیں۔ وحشی نہیں۔ ایک انسان ہوں، ایک دوست ہوں، تاجور تم مجھ پر بھروسا کر دیکھو۔ میں تمہیں محفوظ رکھوں گا۔ تمہارے ماں باپ کو ہندوستان بھجوانے کی پوری کوشش کرونگا۔ لیکن تم نہ جاؤ۔ اچھے تاجور تم نہ جاؤ، ——— خلیق کی درد بھری پکار اب تاجور سامری کے لئے کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ اسکے دماغ میں آزاد ہندوستان کے نقشے اور آزادی کے سہانے خواب کروٹ لے رہے تھے۔ وہ بولا "مجھے جانا ہی ہوگا۔ مجھے جانا ہی پڑے گا۔ میں ضرور جاؤنگا ——— خلیق صاحب"

"تم ضرور جاؤ گے! آہ تم ضرور جاؤ گے، تاجور! میں دیوانہ ہو جاؤنگا ———" یہ کہہ کر وہ تیزی سے جامع مسجد کی گلی میں گھس گئے۔ اور تاجور سامری حیرانی اور افسردگی سے گھنٹہ گھر کی طرف چلا۔ شہر کی بڑی بڑی دکانیں اب کایا پلٹ چکی تھیں۔ بنگالی مٹھائی دکانپر ایک لمبی ڈاڑھی

والے کوئی جالندھری شیخ قابض تھے۔ اس نے مٹھائی کی دکان کو ایک دم کبابوں کی دکان میں بدل دیا۔ حکیم حاکم رائے کی جگہ اب میاں سائیں محمد بیج فروش کا بورڈ نظر آرہا تھا، خالصہ بار ہوٹل کی جگہ اب پاکستانی ریسٹورنٹ نے لے لی تھی، اور ہر طرف ریڑھی، چھبے والے۔ پان سگرٹوں والے۔ دودھ دہی والے مسلمان ہی مسلمان دکھائی دیتے تھے۔ اس کے علاوہ پٹڑیوں پر شہر چھوڑنے والے ہندو اپنے گھروں کا سامان بیچتے نظر آتے تھے۔ پلنگ۔ سوفا سیٹ فرنیچر۔ برتن ریڈیو، غرضیکہ ہر چیز بکنے کے لئے بازار میں رکھی تھی۔ وہ چیزیں جو بڑی بڑی مشکلوں سے تیار کی ہوئی تھیں۔ اب کوڑیوں کے مول بک رہی تھیں۔

پانچ روپے کا ہز ماسٹر وائس کا ریڈیو، دو روپے میں صوفا سیٹ، ایک آنہ میں کانسی کی بڑی تھالی۔ اور کٹوری ساتھ مفت، ایک جگہ ایک مسلمان گاہک ایک ہندو سامان بیچنے والے سے جھگڑ رہا تھا۔

ہندو کہہ رہا تھا، نہ بابا، یہ کوئی انصاف ہے۔ سو روپے کی الماری پانچ روپے کو دے رہا ہوں، آپ کو یہ ہی زیادہ نظر آتے ہیں۔ دو روپے میں الماری! یہ بھی کوئی انصاف ہے!

مسلمان گاہک بولا۔ بھائی یہ روپے بھی غنیمت سمجھو، تم نے کونسا جان مار کر سو روپیہ پیدا کیا ہوگا۔ بلیک ہی کی ہوگی۔ یہ تو ڈپٹی کمشنر صاحب کی مہربانی سمجھو جو مسلمانوں کو لوٹ مار کرنے کی جگہ چیزیں خریدنے پر مجبور کیا۔ ہم نے تو مانگی ایک گھنٹہ کی مہلت مگر وہ تمہارے ایسے عاشق نکلے کہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

ایک راہ چلتے شیخ جی یہ سنکر بولے، اجی چھوڑو بھی کیوں روپیہ ضائع کرتے ہو، یہ سامان کچھ ساتھ تھوڑی اٹھا کر لیجائیں گے۔ ڈپٹی کمشنر خدا تھوڑی ہے کب تک بچا لیگا۔ ان کو ——— دیکھو تو سہی۔

ہندو بولا۔ واہ کیا کہنے!

شیخ جی تلخ ہو کر بولے، اجی تم کیا جانو، بگڑا جو نہیں کچھ! ہم سے پوچھو جنہیں جان بھی مشکل سے ساتھ لے آئے دنگی۔ اب یہاں ایک بھیڑ لگ گئی تھی، پولیس کے سپاہی فوراً پہنچے۔ اور مطلع صاف کیا، تاجور سامری گھر لوٹا، سارے بازار اور گلی کوچوں کے کونوں پر گھر کا سامان بیچنے والے، دکانیں لگائے بیٹھے تھے، عجیب حسرت ناک سماں دکھائی دیا۔ بیس روپے کی چیز کو ایک روپے میں دینے والا ایک آہ سرد بھر کر رہ جاتا،

تاجور سامری دکھے ہوئے دل سے گھر آکر ایک طرف منہ لپیٹ کر پڑ گیا۔

پنڈت نہرو پردھان منتری ہندوستان کے دورے سے پاکستان میں پھنسے لوگوں کی بہت سی امیدیں بندھی تھیں، لیکن جب وہ لائلپور کے زراعتی کالج کے ریسٹ ہاؤس میں آئے اور پُرامید لوگ ان کے پاس جاکر امداد کے ملتجی ہوئے، انہیں ۱۹۴۷ء کے ایک جلسے میں کی گئی تقریر یاد دلائی جس میں اُنہوں نے وعدہ کیا تھا کہ میں لائلپور کو ہر مصیبت میں مدد دونگا۔ چاہے کچھ بھی ہو ہندوستان کی رہنمائی اور امداد میرا فرض ہوگا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے پنڈت جی کو راکھی پیش کی، پہلے تو وہ خاموش نیچی نظریں کئے بیٹھے رہے جب اس دیوی نے بار بار ان کا فرض اور اپنے کام کی اجرت کا تقاضا کیا تو انہوں نے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس دیوی کی طرف پھینکا۔ وہ کہنے لگی پنڈت جی اس راکھی کی قیمت یہ نہیں جو آپ دے رہے ہیں۔ اسکی قیمت وہ ہے جو ہمایوں نے کرونا وتی کو ادا کی تھی۔ ——— میں نے یہ راکھی لائلپور کی عورت ذات کی طرف سے باندھی ہے آپ کو ان کی رکھشا اور مدد کرنی چاہیئے۔ پنڈت جی نے بہت دیر تک خاموشی سے سوچتے رہنے کے بعد کھسیا کر جواب دیا، میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ لائلپور اب پاکستان کا حصہ ہے۔ میں خان ممدوٹ

یا لیاقت علی خانصاحب سے سفارش کرونگا۔

اُس عورت نے جل کر کہا، پنڈت جی اگر لائل پور اب ہندوستان کا حصہ نہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور اور یہ لوگ ہماری کیا رکھشا کریں جو اس فساد کے بانی ہیں۔ آپ اپنے فرض سے کیوں کترا رہے ہیں؟ پنڈت جی اور بھی ندامت میں ڈوب گئے، اور آخر یہ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ اس کے لئے خان ممدوٹ یا لیاقت علی خاں سے درخواست کرو۔ لوگ بے نیل و رام اپنا سا منہ لے کر گھروں کو لوٹ آئے، اس کے بعد ہر طرف ایک نا امیدی اور افسردگی چھا گئی۔

تاجور سامری اپنا نام سنکر زینے میں آیا تو اس کا دوست جلال پینٹر اسے روتا ہوا لپٹ گیا اسکے بھی آنسو بہ نکلے جب دونوں دوست رو دھو کر دل ہلکا کر چکے تو جلال بولا یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے۔ آج کل لوگ باؤلے ہو رہے ہیں۔ تمہارے جیسے حلیہ کا آدمی سکھ کے شبہ میں اکثر مارا جاتا ہے۔ تاجور سامری نے کہا! اس سوال کا حل اس حال میں کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ جلال نے جواب دیا۔ آؤ تم میرے ساتھ چلو میں ماسٹر خدا بخش کے پاس لے چلوں۔ وہ تو تمہارا بھی دوست ہے۔ اتنے میں ——— تاجور سامری کی ماں آگئی تھی۔ اس نے جب بازار جانے کا سنا تو گھبرا کر بولی۔ نہ نہ میں اسے نہ جانے دونگی۔ بھلا — زمانہ ہے اب باہر جانے کا؟

جلال نے کہا ماں مجھ پر آپکو بھروسہ نہیں۔ جلال تو وہی ہے جو ہمیشہ تھا۔ میں ابھی اسے واپس چھوڑے جاتا ہوں ——— یہ کہہ کر وہ تاجور سامری کو ساتھ لیکر نیچے اتر آیا۔ بازار میں پہنچے ایک سپیشل پولیس کا سپاہی اپنے لمبے برچھے، سبز تہمند اور کرتے کے ساتھ مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا سامنے کے مکان پر گھورتا نظر آیا ——— یہ دونوں دوست چپکے سے نکل گئے۔ راستے میں حکیم نورالدین اور تاجور سامری کے جینی پڑوسی شادی رام بابا ملے۔ اسوقت شادی رام کی لمبی ڈاڑھی اور کیس غائب تھے حکیم صاحب اُسے کہہ رہے تھے۔ بھائی وقت وقت کی بات ہے

بال تو پھر بھی اگ آئیں گے۔ اسوقت مصلحت اسی میں تھی۔ اچھا اب تو آپ جا سکیں گے۔ شادی رام نے مسکرا کر جواب دیا۔ بالکل۔ حکیم صاحب پاس کی گلی میں ہو گئے۔ اور شادی رام اپنے بالاخانے کے زینے میں گھس گیا۔ سارا بازار سنسان پڑا تھا۔ کہیں فوج یا سپیشل پولیس کے جوان کھڑے کچھ سوچتے نظر آتے تھوڑی دیر میں ماسٹر خدا بخش کے اڈے پر پہنچے۔ وہ اسوقت بھی ایک شخص کے بال کاٹ رہے تھے تاجور سامری کو دیکھتے ہی کام چھوڑ کر تپاک سے ملے۔ اور مسکرا کر داڑھی کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ کیا حضرت! تاجور سامری نے جھینپ کر کہا اسی سنیچر کو اتروانے تو آیا ہوں۔ وہ اس شخص کو فارغ کر چکے تھے چنانچہ فوراً ہی اسکے بال سنوارنے شروع کر دیئے۔ ماسٹر صاحب خاموشی سے اپنا کام کر رہے تھے مگر ان کے چہرے سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ موجودہ حالات سے بہت دکھی ہیں۔

جب بال بن چکے تو بولے! جلال اب انکو سیدھے گھر پہنچا دو۔ ان کی جان زیادہ قیمتی ہے بیوقوف لوگوں کا کیا ہے۔

جلال بولا۔ آپ کیا کہتے ہیں ماسٹر جی کیا میرے لئے تاجور کوئی غیر ہے۔ یہ کہتے ہوئے اسکی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بال کٹوا کر جب تاجور سامری گھر پہنچا تو اسنے دیکھا کہ صحن میں چارپائی پر ایک دراز قد فوجی افسر بیٹھا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کا دل بیٹھنے لگا۔ کہ اچانک ہی اسکی ماں کمرے سے ایک طشتری مٹھائی لئے نکلی۔ اسے دیکھ کر وہ اطمینان سے بولی۔ آ گئے تم؟ —— لو بھئی آ گیا۔ تمہارا بھانجا۔ پہچانتے ہو! دیکھو جب کے اور اب کے سادھو میں کتنا فرق ہے۔ —— پھر تاجور سامری سے بولی۔ ماموں کو پرنام کرو۔ یہ چاچا محمد بخش کے لڑکے ہیں۔ تاجور سامری نے سر جھکا کر پرنام کیا تو اس نے اسے پیار سے چھاتی سے لگایا۔ اور دیر تک باتیں ہوا کیں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بولا۔ اب اجازت دو بہن پورو۔ پھر آؤنگا۔ میری ڈیوٹی آجکل یہیں ہے۔ کوئی فکر اور خوف کی بات نہیں میرے ہوتے۔ کس کی مجال ہے جو میرے ہوتے

میرے عزیزوں کو تنگ کرے۔

یہ کہہ کر اس نے دس روپے کا نوٹ نکالکر ادب سے تاجور سامری کی ماں کو پیش کیا اس نے انکار کیا تو بولا۔ بہن پورو۔ اتنے سالوں بعد تو میں آیا ہوں بہن کو بھانجے کو خالی ہاتھ ملنا بھی کیا۔

تاجور سامری کے والد بولے۔ اب رکھ بھی لو "جب بھائی خوشی سے دیتا ہی تو پھر کیا ہرج ہی"۔

یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ تاجور سامری کی ماں بولی۔ بھائی کیسی ہی۔ وہ اس سوال پر دکھی لہجے میں بولا اچھی ہی ہوگی۔ اب!

اس کا کیا مطلب!

اس نے کہا۔ وہ بچاری اپنے بیٹے ہی فسادیوں کے ہاتھوں ماری گئی نہ صرف وہ بلکہ دونوں سالے اور ساس بھی سسر پہنچا ہے۔ بُرے حالوں۔ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور چبکا زینے میں اُتر گیا۔ اس کے پیچھے جلال بھی چلا گیا۔

شہر پر اب سو فیصدی مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہندو کچھ تو بھاگ چکے تھے۔ باقی کیمپوں میں چلے گئے تھے۔ مشرقی پنجاب میں سکھوں کے مظالم کی خبروں نے یہاں کے مسلم عوام میں سکھوں کے خلاف آگ لگا دی۔ اور ماسٹر تارا سنگھ کے اس مشورہ پر سکھ مغربی پنجاب چھوڑ دیں، لائل پور کے سکھ عوام دل چھوڑ بیٹھے تھے۔ چنانچہ ڈپٹی کمشنر صاحب نے اسی میں بہتری سمجھی کہ ان کو شہر سے نکال کر خالصہ کیمپ میں پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ اکیدن سب کو ایک طویل قافلے کی صورت میں فوج اور پولیس کی حفاظت میں شہر سے نکالکر خالصہ کالج پہنچا دیا گیا، اس دن سارے مسلمان محلّوں میں کرفیو لگا رہا۔ ہندو، ٹھیلے

تانگوں والوں نے اجرت کی انتہا کردی، ایک پورا تانگہ پچاس سے کم اور ٹھیلہ ستر سے کم نہیں ملتا تھا۔ گھنٹہ گھر سے لے کر خالصہ کالج تک بازار اور سڑکیں سکھ عورت، بچوں اور مردوں سے پٹی پڑی تھی۔ ڈپٹی کمشنر صاحب خود اس قافلے کے ساتھ ساتھ رہے تھے ؛

جو اس رپورتاژ میں موجود ہیں۔ آپ خود پڑھ کر اندازہ لگائیں گے کہ جب بندھن ٹوٹے، محض چند واقعات کا بیان نہیں ہے بلکہ ایک ادبی کارنامہ ہے جس پر تاجور سامری فخر کر سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے پڑھنے والے انسانیت کے اُس درد اور کرب کو محسوس کریں گے جو لکھنے والے کے دل میں تھا۔ یہ رپورتاژ لکھ کر تاجور سامری نے اپنا ادبی قد بہت بڑھا لیا ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی
۶ر جنوری ۱۹۴۹ء

سیّد احتشام حسین

موت اور زندگی کے بیچ

تاجور سامری شہر میں گھوم پھر کر گھر لوٹا تو سب کو سامان گول کئے گھر چھوڑنے کو تیار پایا پتا چلا، کہ آج مال گودام سے ایک گاڑی جانے کا امکان ہے، رام لال اور بھائیا (کرپا رام) اس کے متعلق پتہ چلانے گئے ہیں۔ اور کہ اس گلی میں اب سوائے اس گھر کے سبھی گھروں میں مسلمان آچکے ہیں، گائے بارہ روپے میں ایک مہتر خرید کر لے گیا۔ تاجور سامری کی الماری جو اس نے بڑے چاؤ سے پچاس روپے میں بنوائی تھی۔ تیرہ روپے میں بک گئی تھی۔ بڑا لوہے کا ٹرنک پانچ روپے میں۔ اب صرف مختصر سا سامان تھا جو ساتھ لیجانے کے لئے بندھا پڑا تھا۔ چاچا رکھا رام، چاچی اودا اس کے رشتہ دار سکھوں کے قافلے کے ساتھ خالصہ کالج پہنچ چکے تھے۔

رام لال کا بڑا لڑکا نند کشور دو ٹھیلے لے آیا۔ سب نے جلدی جلدی سامان لادا اور نکل کھڑے ہوئے، گھر چھوڑتے ہوئے سب ایسا محسوس کر رہے تھے۔ جیسے وہ زبردستی کہیں نکالے جا رہے ہوں۔ یہ گلی جو آج سے چند ہی دن پہلے بھری پڑی تھی۔ اور اونچا مندر جو ہر وقت چہل پہل سے معمور رہتا تھا۔ آج ویرانگی اور مایوسی کی تصویر بنکر رہ گیا تھا۔ گلیاں سنسان تھیں مویشی اونے پونے بک رہے تھے یا فوجی یونہی ہنکالے گئے تھے۔

سامان سے بھرے ہوئے ٹھیلے کے ساتھ ساتھ یہ مختصر سا قافلہ کارخانہ بازار سے

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

گزرتا ہوا پانی کی ٹنکیوں کے پاس پہنچا راستے میں کسی نے ان کو کچھ نہیں کہا۔ سبھی اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے ہر طرف ہر دکانپر اجنبی مسلمان نظر آتے تھے۔ لیکن ہجرت کرنے والوں کے لئے یہ چہل پہل بھی ویرانی سے کم نہ تھی۔ اچانک رام لال اور بھائیا (کرپارام) نے آگے سے آکر روکا۔ کہ آج گاڑی نہیں جائیگی۔ اس لئے گھر لوٹ چلو۔ رام لبھایا نے کہا۔ ساری گلی میں مسلمان آگئے ہیں اس لئے واپس جانا خطرے سے خالی نہیں۔ گاڑی آج نہیں چلی کل چلے گی۔ برسوں چلے گی۔ دوارکا بھون میں جب تک کیوں نہ رہا جائے۔ اس کی انہوں نے بھی تائید کی اور ٹھیلے دوارکا بھون کی طرف مڑ گئے۔

دوارکا بھون، کبھی ایک جاپانی کپاس کمپنی کا دفتر تھا۔ جسے بعد میں شہر کے ایک آڑھتی لالہ دوارکا داس نے خرید کر سرائے کی صورت دیدی تھی۔ اور آج کل وہاں شہر کے وہ لوگ پڑے تھے جن کے خیال میں مال گودام سے ریل ضرور ایکدن جائیگی۔ اور وہ یہیں سے سیدھے ہندوستان پہنچ سکیں گے۔

یہ لوگ بھی ایک موزوں جگہ دیکھ کر ڈٹ گئے۔ سرائے میں خوب رونق تھی۔ زیادہ تر میانوالی اور جھنگ ضلع کے لوگ یہاں ٹھیرے تھے۔ عورتیں بچے۔ مرد۔ سبھی یہاں آکر ایکمرتبہ پھر تاجور سامری کو اطمینان کا احساس ہوا۔ کہ چلو اس اجنبی گلی میں سے تو یہ جگہ ہزار درجے اچھی ہے یہاں سینکڑوں قسم کے لوگ تھے۔ طرح طرح کے کردار۔ تاجور سامری کو نفسیاتی مطالعے کا خاص مشغلہ ملگیا۔ اُسنے اسی دن علاج شمسی کی پریکٹس شروع کردی۔ چنانچہ شام تک ساری سرائے میں وہ ڈاکٹر صاحب کے نام سے مشہور ہوگیا۔ شام کو ست سنگ کی رونق جمی، عورتوں نے بھجن گائے، مردوں نے تقریریں کیں۔ اور ڈاکٹر (تاجور سامری) صاحب نے حفظانِ صحت کے اصول سمجھائے۔ بڑی رات گئے تک لوگ گپیں ہانکنے کے بعد سو گئے۔

تاجور ساری کو جن لوگوں سے روز واسطہ پڑتا تھا ان میں پردھان جی کی ایک خاص شخصیت تھی۔ یہ صاحب ساٹھ برس سے اوپر کے مگر وضع قطع اور لباس میں جوانی کا احساس دلاتے تھے ان کا نام کسی کو معلوم نہ تہا۔ پردھان ان کا عہدہ تھا۔ لقب یا عرف۔ بہر حال پردھان ہونیکا انہیں بے طرح احساس تہا۔ اور اپنے اس اہم درجے یا رُتبے کا سب کو احساس کراتے رہتے تھے ہر روز اس چھوٹی سی دنیا کے لئے وہ نئے قانون رہنے لینے کے نئے طریق رائج کرتے۔ اس چھوٹی سی دنیا کے یہ با اختیار راجہ تھے، کوئی بات کسی کا ذاتی معاملہ ہو۔ کوئی بلائے نہ بلائے لیکن پردھان جی ضرور دخل دیتے۔ سارا دن وہ لوگوں کے جھگڑے چکاتے بقدر مول کے فیصلے کرتے پھرتے نظر آتے، پردھانگی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے کو دھارمک معاملوں کا آچاریہ بھی سمجھتے سفید بگلے جیسے کھدر کا لباس ان کی اہمیت کو بڑھلنے کو کافی تہا۔ ان کو یہ رتبہ کس طرح ملا۔ یہاں کا پردھان انہیں کس نے چُنا۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ ایک راز دار سے اتنا پتا چلا کہ شہر میں بھاگ ملچنے پر ان صاحب نے گوجرے سے آکر یہاں ڈیرہ ڈالدیا تھا۔ وہاں مکانوں کی دلالی کرتے تھے۔ اب اس لئے یہاں جمے تھے کہ اس سرائے کا سودا کسی مسلمان سے طے کرکے اور روپیہ انٹی میں باندھ چلتے بنیں۔ چنانچہ اکثر کئی اجنبی مسلمان ان سے آکر ملتے رہتے تہے۔ اب ناامیدی اور خطرے کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے نہ صرف مسلمانوں سے ملنا جُلنا ترک کر دیا تھا بلکہ ایک نئی پابندی لگا دی تہی۔ کہ سرائے کا بڑا دروازہ ہر وقت بند رہے۔ اور جو کوئی نیا شرنارتھی آئے۔ وہ پہلے خواست لکھکر دربان کو دے۔ اور بعد منظوری اور حصول اجازت کے اندر داخل ہو سکے۔ اور کسی مسلمان کو پاس نہ پھٹکنے دیا جائے اس راز دار سے اس نئی پابندی کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ آپ ایک جینٹ کے خوجے سے بیعانہ لیکر ہضم کر چکے تھے۔ اور اب اس سے انکاری تہے۔ اب اس حکم پر سختی سے عمل ہونے

لگا تھا۔ یہ ہر صبح کو تاجور سامری کو جگاتے اور کہتے ڈاکٹر جی آپ دوسروں کو کیا ہدایت کرسکیں گے جب خود ہی صبح دس بجے تک سوتے رہیں گے۔ اور وہ اس بلا سے بچنے کی کوشش کرتا۔ لیکن کہاں، بلکہ ہر وقت ڈاکٹر صاحب کی طلب رہتی۔

ایک اور صاحب تھے، جیونا بھگت، یہ بھگت کا لفظ ضرور عام غلط فہمی کا باعث بنتا ہے۔ ورنہ وہ ظاہر میں بھگتی سے کوسوں دور تھے۔ چہرے سے مکاری اور بربریت ہر وقت ٹپکتی رہتی۔ اوپر کے جبڑے کا تیسرا دانت سونے کا۔ بڑے بڑے بال۔ سر پر گنڈوں کی طرح، پشاوری لنگی لپیٹی ہوئی۔ کھدر کا تہبند ہر وقت بڑی بڑی ڈینگیں مارتے۔ اپنی بہادری اور فراخدلی کی گپیں ہانکتے ان کے ساتھ ایک بلی کی طرح کی مسکین اور رحم رخ سی عورت تھی۔ ایک مریل سا بچہ جسے وہ ہر وقت چھاتی سے لگائے رہتی۔

کوئی بات ہو جیونا بھگت بیچ میں ٹانگ ضرور اڑا دیتے اور جو کوئی انکی رائے کی مخالفت کرتا اسکے ایکدم جانی دشمن ہوجاتے۔ اگرچہ آدمی تھے۔ لیکن اونٹ کی طرح گہرا کینہ دلمیں رکھتے۔ اسکے باوجود وہ جیونا بھگت تھے۔ اور پردھان جی کے مشیر خاص، فساد سے پہلے انکو اکثر جوئے بازوں اور بدمعاشوں کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ ایک بہن جی تھیں ادھیڑ عمر کی کم رو سی عورت لیکن انہیں اپنی صورت اور عمر کے متعلق بڑی غلط فہمی رہتی۔ جہلم ضلع کی رہنے والی۔ لائیلپور میں ایک مکان کی مالک، خاوند رنگون کے قریب کہیں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ جس کا وہ رعب سب پر ڈالتی تھی۔ جیونا بھگت انپر خاص طور سے مہربان تھے انکے بھاری رٹنکوں اور ان کی جوان لڑکی پر ان کی ہر وقت نظر رہتی۔

ایک شام کو پردھان جی نے مطالبہ کیا کہ چونکہ شرنارتھی زیادہ آرہے ہیں اسلئے ایک باقاعدہ ورکنگ کمیٹی بنادی جائے۔ یہ مطالبہ دراصل حکمی اعلان تھا۔ اور انہوں نے بطور پردھان خود ہی اپنی گورنمنٹ نامزد کردی۔ پورٹ فولیوز ان لوگوں میں اسطرح تقسیم ہوئے۔ یعنی وزیر صحت، ڈاکٹر تاجور سامری، وزیر ڈیفنس اور انتظام، جیونا بھگت، وزیر سول سپلائی، بہن جی۔

لوگوں کو جیونا بھگت اور بہن جی کے عہدو پر اعتراض تھا۔ لیکن پردھان جی کے حکم کو نہ ماننا ناممکن تھا۔ ——— ایک صبح کو صدر دروازے پر شور سنائی دیا۔ وزیر ڈیفنس جیونا بھگت فوراً موقعہ پر پہنچے۔ پتا چلا کہ شہری سے ایک شرنارتھی اندر آنا چاہتا ہے اور دربان درخواست کا مطالبہ کرتا ہے شرنارتھی کہہ رہا تھا یہ سرائے لالہ دوار کا داس کو میری ہی وجہ سے ملی ہے۔ اس لئے درخواست کی ضرورت نہیں۔ لیکن دربان اور جیونا بھگت پردھان جی کے حکم سے مجبور تھے اور پردھان جی اسوقت تک اجازت کیونکر دیتے جب تک انکے دفتر میں درخواست نہ پہنچے۔ بہت شور مچنے پر تاجور سامری بھی وہاں پہنچا۔ باہر والا اُسے پہچان کر پکارا پنڈت جی! مدد کرو، ان سے کہو دروازہ کھولیں۔ مگر کیسے! آخر یہ تجویز تاجور سامری کے ذہن میں آئی کہ آپ درخواست لکھ کر ان کی طرف سے دفتر میں دے آئے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور بعد منظوری بچاروں کو اندر آنے کی اجازت ملی۔ یہ آنیوالے، ایک بوڑھی عورت تھی اور دوسرا اسکا لڑکا لابھ چند۔ یہ کئی بھائی تھے۔ اور مختلف کام کرتے تھے۔ سب وقت سے پہلے شہر چھوڑ گئے۔ لیکن لابھ چند اپنے تانگہ کو چھوڑ کر اور موجودہ اندھی کمائی چھوڑ کر نہ جا سکا۔ یہ شخص سواریوں سے سختی کرنے اور زیادہ پیسے لینے میں بدنام تھا۔ اس پر بھی ہندو قوم کا درد اسکے دلمیں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ خاص طور پر جب سے اسکے مسلمان دوست نے اپنا مستعار دیا ہوا گھوڑا واپس مانگا تو وہ مسلمانوں کی کمینگی اور ہندو دشمنی کا قائل ہو گیا تھا۔ اب وہ مسلمانوں کا کٹر دشمن تھا۔ کیوں نہ ہوتا۔ بھلا یہ کوئی انسانیت کی بات تھی۔ اُس نے اُسوقت اپنا گھوڑا واپس مانگا۔ جبکہ روپے کمانے کا موسم زوروں پر تھا ——— خیر یہ ہنگامہ فرو ہوا اور سرائے کی اس دنیا کا کام معمول کیمطابق چلنے لگا۔

ایک شام کو دربان کی غلطی سے دروازہ ذرا دیر کو کھُلا رہگیا۔ لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سلسلہ عورتوں بچوں اور مردوں کا اندر گھسا آرہا ہے۔ ڈیفنس منسٹر جیونا بھگت کوٹھے پر بیٹھے تاش میں جٹے ہوئے تھے۔ اطلاع ملنے پر غصے سے لال پیلے ہو کر لپک کر نیچے آئے۔ آنیوالے آچکے تھے،

دربان بھی لپک کر دروازہ بند کر چکا تھا۔ اور وہ لوگ چپکے، چپکے برآمدے قریب ہو بیٹھے تھے۔ پردھان جی آ پہنچے۔ اوہ اس لاقانونی کو اپنی توہین سمجھنے لگے، جیونا بھگت الگ لاٹھی زمین پر مار مار کر اپنی اہمیت اور رُتبے کا احساس دلا رہے تھے۔ لیکن وہ لوگ تھے کہ خاموش اور بے حس، جیسے یہ سب کچھ کچھ ہو ہی نہیں رہا۔ پردھان جی کہہ رہے تھے اچھا آئے سو آئے مگر اب قانون تو پورا کرو۔ ایک آدمی باہر جائے اور درخواست لکھکر دفتر میں بھجوا دے میں جاکر فوراً منظوری دیدونگا۔ بات معقول تھی لیکن اب باہر کون جائے۔ پردھان جی نے تاجور سامری کی طرف امداد طلب نگاہوں سے دیکھا، لیکن وہ چپکا بیٹھا رہا۔ آخر لوگوں کے کہنے سننے سے ایک شخص تاجور سامری سے پنسل سے درخواست لکھوا کر باہر گیا۔ پردھان جی اپنے دیوانخانے میں گئے جو آج سے پہلے غسلخانہ تھا۔ دربان نے درخواست لیکر دفتر میں پہنچائی۔ یوں ضابطہ پورا ہوا۔ تب کہیں شانتی ہوئی

شرنارتھیوں کی آمد ابھی جاری تھی، دیہات کے لوگوں نے ریل گاڑی کے لالچ میں ادھر ہی رُخ کیا۔ اور ادھر جگہ نہیں رہی تھی۔ لوگ کوٹھے برآمدے کمرے اور صحن تک میں پٹے پڑے تھے اس لئے اب اجازت نامہ حاصل کرنیکے حکم پر اور بھی سختی سے عمل ہونے لگا تھا۔

ایک صبح کو سڑک پر ایک بھاری ٹرک کے رکنے اور بہت سے آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ دربان نے دراڑ سے جھانکر دیکھا۔ کہ دیہاتی شرنارتھی سڑک سے سامان اتار رہے ہیں۔ اور سرائے کے دروازے کے باہر رکھا جا رہا ہے۔

اب پھر وہی قصہ دہرایا جانے لگا۔ باہر والے دروازہ کھولنے کا مطالبہ کرتے اور دربان داخلے کے لئے درخواست کا، خوب چخ دھاڑ مچی تھی۔ باہر والے دروازہ توڑ ڈالنے کی دھمکی دے رہے تھے، مگر یہاں کون سنتا تھا۔ اتنے میں مسلمان پناہ گزینوں کا ایک آوارہ گروہ اوپر ٹوٹ پڑا۔ دروازہ ابھی نہیں کھلا تھا اور باہر رہنے لوگ حملہ آوروں کے برچھوں، چھروں کا

نکلا رہے تھے، آخر تاجور سامری کے زور دینے پر دروازہ کھلا۔ جیونا بھگت۔ اور لالچند تلواریں گھماتے باہر نکلے۔ حملہ آور غیر منظم تھے۔ خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلے۔ چند عورتیں زخمی ہو گئی تھیں۔ ان کو اٹھوا کر اندر لایا گیا۔ جیونا بھگت اور لالچند، ٹوٹے ہوئے ٹرنکوں سے جیبوں کی بھوک مٹانے لگے۔ آخر سارا سامان اندر آگیا۔ تاجور سامری زخمیوں کی مرہم پٹی میں لگ گیا۔ عورتوں نے آنیوالوں کیلئے کھانا پکانا شروع کیا۔ جیونا بھگت ایک آٹے کی بوری بھی اٹھا کر اندر لائے تھے۔ اب لالچند اور ان میں جھگڑا چل رہا تھا۔ یہ بوری میری ہے۔ اور مالک بچارے کی کوئی سنتا ہی نہ تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ بوری میری ہے۔ میں نے مہنگے بھاؤ گندم خریدی تھی۔ میری لڑکی اور بیوی نے خود پیسی تھی۔ لیکن اسکی کوئی سنتا تھا۔ تاجور سامری نے کہا لڑتے کیوں ہو، آٹا سب کا ساجھا سمجھ لیا جائے اور آنیوالوں کو پکا کر کھلایا جائے۔ اس تجویز کو سب نے مان لیا۔ آٹے کا مالک بھی اسپر مطمئن ہو گیا۔ اب جیونا بھگت نے اپنی بیوی کو کہا۔ آٹا سان! وہ بڑھی اور بوری کو قبضے میں کر لیا۔ تاجور سامری نے دیکھا، اس نے سب کی نظر بچا کر اپنا کنستر بھر لیا۔ جیونا دور کھڑا کنکھیوں سے بیوی کی یہ ہشیاری دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ آخر خود بھی ادھر گیا اور چپکے سے ایک بڑی سی بالٹی بھر کر ایک طرف چھپا دی اور اونچی آواز سے بولا۔ جلدی کرو۔ بچارے بھوکے ہیں۔ بھئی ہم تو نشکام سیوا کرنا اپنا دھرم سمجھتے ہیں۔ تاجور سامری یہ سنکر مسکرایا۔ غالباً جیونا بھگت سمجھ گیا۔ کیوں کہ جب سب کھانے پینے میں لگ گئے۔ تو وہ تاجور سامری کو ایک طرف لے جا کر بولا، پنڈت جی میں حرام خوری کے سخت خلاف ہوں آٹے کی بوری میں لایا تھا جان خطرے میں ڈال کر۔ اپنا حصہ نہ رکھتا؟ میرا حق تھا! ——— اور پھر دھیرے سے کہا ——— میری اور آپ کی تو ہر چیز ساجھے کی ہے۔ سمجھے ——— یہ کہکر وہ جلدی سے پردھان جی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ جو ایک شرنارتھی سے اسکی داستانِ غم سن رہے تھے جیونا بھگت نے فوراً اپنا انداز بدل لیا۔ اور چہرے پر غم کے آثار پیدا کر کے اس بات چیت میں

شامل ہو گیا۔

یہ چھوٹا سا کیمپ اپنی محدود لیکن چہل پہل کی زندگی کو اسی اطمینان سے کئی دن تک چہکتے دیکھتا رہا۔ اب نئے شرنارتھی آنے بالکل رک گئے تھے، لوگ باگ شہر میں آزادی سے پھرتے۔ سودا سلف خریدتے، ڈپٹی کمشنر صاحب کی کوٹھی کا چکر بھی لگا آتے کہ ان سے اپنے لئے ٹرک یا گاڑی چلوانے کا انتظام کریں۔ لیکن وہ دو ایک دن سے پاکستان کی نئی اسٹیسٹ کے انتظام کے سلسلے میں لاہور جا چکے تھے۔ ایکدن اچانک یہ بھنک کانوں میں پڑی کہ بلوچ ملٹری کے بہکانے پر مشرقی پنجاب کے مصیبت زدہ مسلمان حملہ کرنیوالے ہیں۔ دوارکا بھون میں اس خبر کو ایک افواہ سمجھ کر نظرانداز کر دیا گیا۔ لیکن ....

ایکدن جبکہ تاجو رسا مری صبح کے وقت حاجت رفع کر کے کوٹھے سے اترا تو اس نے سارے کیمپ میں ایک مستعدی اور گھبراہٹ کے آثار دیکھے، پردھان جی اور جیونا بھگت، اچارپلنگوں کے پیروے اور پٹیاں الگ کر رہے تھے اور لالچند اپنی دیسی ساخت کی تلوار کو نلکے کے سیمنٹ کی فرش پر تیز کر رہا تھا۔ جرائم پیشہ بستی کے نوجوان اپنے ٹاکوؤں اور برچھوں کو چمکا رہے تھے۔ اور عورتیں اور بچے ایک اندھیرے اور مضبوط دروازے والے کمرے میں دھکیلے جا رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں میں سراسیمگی تھی۔ جیونا بھگت کہہ رہے تھے، ماتاؤں آج میں اپنی تلوار کو ملیچھوں کا خون پلاؤں گا۔ تمہاری عزت اور لاج کی حفاظت کا بوجھ آج میرے کندھوں پر ہے۔ لالچند نے اپنی تلوار کو بڑھتی ہوئی دھوپ میں چمکاتے ہوئے کہا۔ میں اپنی بہنوں اور ماتاؤں کے لئے سب سے پہلے قربانی دونگا۔ تم بیفکر ہو کر حفاظت کی جگہ چلی جاؤ۔ آخر سب عورتیں بچے اس کمرے میں چلے گئے۔ اب لوگ کوٹھوں پر چڑھنے لگے۔ بڑا اور پرانا پھاٹک بند کر دیا گیا۔

صحن کے چاروں کونوں میں زینے تھے۔ سب اوپر چڑھ گئے تو ان زینوں کو فالتو چارپائیوں اور تختوں سے پاٹ دیا گیا۔ تاجور سامری اور اس کے بھائی کوی پرکاش کو بھی اسکی ماں اوپر کوٹھے پر لے گئی، اس نے عورتوں کے ساتھ کمرے کی حفاظت کی جگہ مردوں کے ساتھ رہ کر لڑنا پسند کیا۔ تاجور سامری کا باپ کو پارام لاغر ایک طرف مرجھایا سا بیٹھا تھا۔ لالچند تلوار گھماتے ہوئے سب کا حوصلہ بندھا رہا تھا اور جیونا بھگت ڈیفنس منسٹر کی حیثیت سے لوگوں کو حملے سے بچنے کی تجویزیں اور ہدایتیں سمجھا رہا تھا۔ پردھان جی ہیڈ آف گورنمنٹ کی حیثیت سے کونے کے کمرے میں جلوہ افروز تھے۔ جرائم پیشہ بستی کے جوان اپنے بھالوں اور ڈاکوؤں سے لیس تھے۔ دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ اور ان بہادروں کی ہمت آزمائی اور نمائشِ مردانگی کا وقت نکلا جا رہا تھا سب مایوس ہو چلے تھے۔ کہ اچانک بڑے دروازے پر بھاری بھاری چوٹیں پڑنے لگیں سب چوکنا ہو گئے۔ ڈیفنس منسٹر جیونا بھگت کی ہدایت کے مطابق جرائم بستی کے جوان چاروں کونوں کے محاذوں پر ڈٹے تھے۔ اور لالچند جیونا بھگت کی نائبی میں درمیان کھڑے حملے کا انتظار کر رہے تھے۔ لالچند نے نعرہ مارا جو بولے سو ابھے۔ سب پکار اٹھے۔ ہندو دھرم کی جے، یہ جیکار سینکڑوں گلوں سے نکلا تھا۔ باہر والوں کو نہ جانے کیا گمان ہوا انہوں نے اوپر سے ایک دیسی ساخت کا بم پھینکا۔ جو صحن میں گر کر پھٹ گیا۔ اس سے ڈیوڑھی کے قریب کی ایک کچی دیوار گر گئی۔ دروازے پر چوٹیں پڑ رہی تھیں۔ لوگوں کے حوصلے ٹوٹے جا رہے تھے۔ اچانک ڈیوڑھی سے داخل ہوتے ہوئے بائیں جانب کے دروازے توڑ کر حملہ آور اندر گھس آئے۔ اوپر والوں نے خوب اینٹیں برسانی شروع کیں۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ وہ صحن کی طرف نہ بڑھ سکے۔ اور ان کمروں کا سامان لوٹنے لگے۔ ٹرنکوں کے تالے توڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پردھان جی یہ دیکھ کر غش کھا کر گر پڑے مگر وہاں

بند ٹوٹتا ہے

ریل گاڑی رات کی خاموشی کو چیرتی فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔

تاجور سامری لائل پور سے ڈھابان سنگھ تک گاڑی میں کھڑا چلا آ رہا تھا۔ اس ڈبے میں لوگ اس طرح بھرے تھے کہ تل دھرنے کو جگہ نظر نہیں آتی تھی۔ باہر تند اور ٹھنڈی ہوا چیخ رہی تھی اور اندر بحثوں اور باتوں کا بازار گرم تھا۔ ہر چار آدمیوں کی ٹولی ایک مجلس کی حیثیت رکھتی تھی، اور بولنے والے اپنی اپنی پسند کے موضوعوں پر بول رہے تھے۔ اور جو نہیں بول سکتے تھے وہ محض سُن رہے تھے۔ ایک لالہ جی کاروبار کے مندے ہونے کا الزام نواکھالی کے سر تھوپ رہے تھے اور اپنی بیکاری کا رونا روتے ہوئے چند دیہاتی لوگوں کو اپنے دکھ میں مبتلا کر رہے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کے خان صاحب ایک مولوی سے مذہب کے معاملہ پر الجھ رہے تھے مولوی صاحب مذہب کو زندگی کی لازمی ضرورت مانتے تھے اور خان صاحب اضافی چیز۔ ایک بوڑھے شیخ جی اگرچہ کم بولتے تھے لیکن جب بھی لب کھولتے مولوی صاحب کو آڑے ہاتھوں لیتے، اور بچارے مولوی صاحب اس دو طرفی حملے سے بیزار ہو کر تسبیح کو زور سے گھمانے لگتے۔ ایک لمبے قد کے بھاری بھرکم سردار جی بھیڑ میں دھنسے ہوئے کھڑے کھڑے اونگھ رہے تھے۔ تاجور سامری خاموشی سے اپنی سیٹ کے ایک کونے پر چوتڑ کی ایک پھانک ٹکائے اس عجیب گہما گہمی کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ کہ اچانک گاڑی ایک زور کے دھچکے کے ساتھ رک گئی

انہیں کون پوچھتا۔ سبھوں کو اپنی پڑی تھی۔ اتنے میں صدر دروازہ بھی متواتر بھاری چوٹوں کی تاب نہ لاکر ٹوٹ گیا اور اب تو اوپر والوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑنے لگے۔ کیونکہ یہاں تو ایک بے پناہ بھیڑ تھی۔ لیکن الچند اور جیونا بھگت پکار پکار کر سب کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ بہادرو!

پولیس کا مسلح سپاہی صحن میں بچتا بچاتا آگیا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ میں صلح کرا دونگا۔ مگر شرط یہ کہ ان کو لوٹ کھسوٹ کرنے کی اجازت دیدو۔ اسپر جیونا بھگت نے زور سے اینٹ اسپر دے ماری سپاہی نے رائفل تان دی۔ جیونا بھگت دیوار کی اوٹ میں ہوگئے اور گولی جرائم پیشہ بستی کے ایک جوان کے دماغ کو چیرتی ہوئی کہیں گم ہوگئی۔ سپاہی اپنا کام کرکے بھاگ چکا تھا۔ اور مرنیوالے کا باپ بجائے رونے کے دیوانوں کی طرح ناچنے لگا۔ اور زور زور سے کہنے لگا۔ میں پار لگ گیا میری جن کٹ گئی۔ میرا بیٹا شہید ہوگیا۔ اس غم زدہ بوڑھے کے اس رویّے پر سب کو جوش آگیا۔ اور سب نے اینٹوں اور پتھروں کی بارش شروع کردی۔ لیکن سب تھک چکے تھے۔ دیواریں نیچی ہوتی جارہی تھیں۔ اور ساتھ ہی سب کے حوصلے بستی اور مایوسی کی طرف دھیرے دھیرے مائل ہونے لگے، ادھر حملہ آوروں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ ان کی طرف سے پستول ریوالور اور رائفلیں استعمال ہونے لگیں تھیں۔ پچھلی طرف بھی حملہ آور اوپر آنیکی کوشش میں کامیاب ہوتے نظر آرہے تھے۔ سامنے سکول کی دیوار پر ایک دیسی پادری افسوس اور مایوسی کے عالم میں کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ دوار کا بھون اسے مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ لوگ آغا نجیب اللہ خاں سپرنٹنڈنٹ پولیس کو فون کرنے کے لئے التجا کر رہے تھے پہلے تو وہ کھڑا رہا اور آخر نیچے اتر گیا۔ حملہ آوروں کا زور بڑھتے دیکھ کر تاجور سامری کے ذہن میں اچانک امید کی روشنی اپنی پوری قوت سے جھلکی اور اُس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ایک چبوترے پر کھڑے ہو کر اونچے گلے سے کہنا شروع کیا۔ اس کی ماں اور بھائی بھی اسکے ساتھ کھڑے تھے ـــــ تاجور سامری کہہ رہا تھا

"مومنو! رسُول کے شیدائیو! ، میری ایک بات سنو، خدا کے لئے شہید اعظم حسینؑ کے لئے میری ایک عرض سنو، اسپر چاروں طرف سے حملہ آوروں نے

ہاتھ روک لیا، اور دو ایک آوازیں ادھر سے آئیں کہ کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔

تاجور سامری نے پھر کہنا شروع کیا۔

مسلمانو! ۔ تم اس روشنی کے مینار کی کرنیں اپنی روحوں میں لئے ہوئے ہو، جس نے سورج کی طرح بغیر کسی تمیز اور رعایت کے اپنی روشنی ہر طرف پھینکی، مان لیا کہ تم پر مشرقی پنجاب کے ہندو اور سکھوں نے ظلم کیا۔ وہ ظالم تھے گناہ گار تھے، بیشک، میں اسکی تائید کرتا ہوں، لیکن انکی سزا ہمکو ملنی چاہیئے۔ یہ نامناسب ہے! کم از کم اسلامی روایات کے مطابق نہیں، ہم تو خود اپنا سب کچھ چھوڑ کر یہاں سے جا رہے ہیں مرے ہوئے کو مارنا کہاں کی مردانگی ہے۔"

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تاجور سامری کی تقریر حملہ آوروں کے کانوں سے گزر کر روحوں میں اُتر گئی، کیونکہ سب کے چہرے اچانک سنجیدہ ہو گئے، ہاتھوں نے حرکت کرنا اور زبانوں نے گالیاں بکنا دھیرے دھیرے ترک کر دیا۔ ایک ادھیڑ عمر کا مزدور سا مسلمان بھیڑ سے نکلا اور کہنے لگا۔ بھائیو! اس شخص نے ٹھیک کہا ہے۔ واقعی اب ہمیں مظلوم کو زیادہ نہیں ستانا چاہیئے۔ جب انہوں نے ہمیں کہا ہی کچھ نہیں تو ہم انکو تباہ کیوں کریں۔ چلو یہاں سے۔

اس شخص کی یہ فہمائش برمحل تھی۔ اس لئے سب پر اثر ہوا۔ اور سب نے اپنا رخ باہر کی طرف پھیر دیا، حملہ آوروں کو اس طرح مڑتے دیکھکر ڈیفنس منسٹر جیونا بھگت کو جوش آگیا اور موٹی موٹی گالیاں برسانی شروع کر دیں، لال چند ایک قدم اور بڑھا، اور ایک بھاری اینٹ کھینچ کر دے ماری جو اس ادھیڑ عمر مزدور کا سر پھوڑتی ہوئی ایک نوعمر شخص کے گھٹنے پر لگی۔ تاجور سامری اپنا سب کیا دھرا اسطرح چوپٹ ہوتے دیکھکر سر پیٹ کر رہ گیا۔ اس نے پھر کچھ

کہنے کی کوشش کی، لیکن جیونا بھگت نے اسے چوتڑے سے پنچے کھینچ لیا۔ اور اُدھر حملہ آور پھر بھڑک اٹھے تھے۔ انہوں نے اب نہایت شدت سے تباہی مچانی شروع کردی۔ ڈیوڑھی پر پڑی ہوئی ایک دائم المریض بڑھیا کو ایک غضبناک حملہ آور نے ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ اور دوسروں نے صحن کا کاٹھ کباڑ اٹھا کر مٹی کا تیل چھڑک آگ لگا دی۔ ان میں چند آدمی غصّے میں ہونٹ چباتے ہوئے پچھواڑے کی طرف بھی گئے وہاں کرسچین سکول کے ہندو پوربیے مالی بدقسمتی سے اپنے غیر محفوظ مکان میں مل گئے۔ ایک تلوار والے نے ایک پوربیا ہاتھ سے چھوٹے مالی کا سر اڑا دیا، اور ایک نے دوسرے کے برچھا گھونپا۔ وہ جب برچھا نکال لینے کے بعد۔ گر پڑا تو اسے پھر اٹھایا گیا اور آگے چلنے کو کہا گیا۔ وہ بچارا ہاتھ جوڑتا پاؤں پڑتا، مگر وہاں کون سنتا تھا۔ اسکی پیٹھ سے خون تیزی سے بہ رہا تھا ایک اونچی سی جگہ پر جا کر وہ بالکل چت گر گیا۔ اب حملہ آوروں کے سر و پر خون سوار تھا ایک شخص نے اسکی زبان کھینچ کر اسکے دانتوں میں دبائی اور چھرے سے اُسے ذبح کرنا شروع کیا۔ اور پھر بہت سی تلواروں نے اسکو قیمہ کردیا۔ تاجور سامری یہ انسانیت سوز منظر نہ دیکھ سکا اور بیہوش ہو کر گرنے کے قریب تھا کہ اس کی ماں اور بھائی نے فوراً اسے سنبھالا۔ اور ایک طرف لے گئے۔

اب دوارکا بھون والے بے بس تھے، موت ان کے سامنے ناچ رہی تھی۔ اب ہر طرف ایک کہرام مچا تھا۔ اچانک مسلح پولیس کا ایک دستہ، حملہ آوروں کو کھدیڑتا ہوا اندر گھسا، ملک غلام حیدر سٹی انسپکٹر پکارتے ہوئے زینہ چڑھ رہے تھے۔ لوگو، گھبراؤ مت، مدد آپہنچی۔ پولیس آگئی۔ لوگوں میں پھر بھروسا پیدا ہونے لگا۔ پولیس نے بے دلی سے اوٹ پٹانگ طور پر گولیاں ہوا میں چلانی شروع کیں ملک غلام حیدر نے خود ریوالور سے فائر کئے۔ ساتھ ساتھ وہ گالیاں بھی دے رہے تھے۔ حملہ آوروں کو،

جلد ہی آگ پر بھی قابو پا لیا گیا۔ اور تھوڑی دیر پہلے جو جگہ میدان جنگ کی تصویر پیش کر رہی تھی اب پُر امن ہو گئی۔ اُس تاریک کمرے سے عورتوں بچوں کو نکالا گیا، وہ سب روتے اور دھاڑیں مارتے نکلے۔ لیکن باہر کا بدلا ہوا ماحول دیکھ کر ایک بھروسا اور امید کا سماں چھا گیا، پولیس کے بیس مسلح سپاہی ہر طرف گھوم پھر رہے تھے۔ ملک صاحب نے سب کے بیچ میں کھڑے ہو کر کہا۔ اپنا اپنا سامان سنبھال کر باندھ لو۔ ابھی ٹرکوں اور لاریوں سے سب کو آریہ سکول کیمپ میں پہنچا دیا جائیگا اتنے میں شہر کی مسلم لیگ کے ذمہ دار لوگ بھی آ گئے۔ انہوں نے حملہ آوروں کے اس رویے کی مذمت کی۔ شیخ بشیر احمد چیف بوٹ ہاؤس کے چھوٹے بھائی شیخ محمد صدیق تاجور سامری کو اس جگہ دیکھ کر رو پڑے اور زور سے کہنے لگے۔ تاجور! تم اس قتل گاہ میں کیوں آئے۔ ظالم تم بھی ہندوستان جا رہے ہو، اُردو کے مقبول عوامی شاعر! تاجور سامری آنکھوں میں آنسو لئے خاموش تھا،

اتنے میں ایک بڑھیا نے ملک صاحب سے شکایت کی کہ فلاں سپاہی مجھ سے سوٹ کیس مانگتا ہے۔ ملک صاحب یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے اور اس سپاہی کو سب کے سامنے خوب ڈانٹا پھٹکارا پھر دوسرے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ دوستو، عبرت حاصل کرو، ان لوگوں میں بہت سے لکھ پتی ہونگے۔ مگر آج ان کی کیا حالت ہے۔ خُدائے قہر سے ڈرو، ذرا سوچو، آجتک جو تمہارے درمیان رہے وہ تم سے اسطرح زبردستی الگ کئے جا رہے ہیں۔ تم کو انکی مدد کرنی چاہیئے تھی۔ لیکن تم اسکی جگہ ان کا سامان بھی چھیننا چاہتے ہو۔۔۔۔۔۔ ملک صاحب کی اس تقریر نے سپاہیوں پر بہت اچھا اثر کیا۔ ایک مسلم نیشنل گارڈ کے رضا کار نے آکر کہا کہ لاریاں آ گئیں۔ ملک صاحب نے حکم دیا کہ پہلے عورتیں اور کچھ سامان بھیجا جائے۔ اسپر ساری عورتیں دوڑ دوڑ کر لاریوں میں بیٹھنے لگیں۔ اور تھوڑی دیر میں دوارکا بھون کی رونق کا اہم حصہ

لاریوں میں بھر کر آریہ سکول کیمپ کو چلدیا۔ مرد لاریوں کی دوسری کھیپ کا انتظار کرنے لگے۔ جیوناتھ بھگت اور لالچند اپنا کام کرنے لگے۔ وہ بہن جی کے ٹرنکوں کو اپنی چابیوں سے کھول کر اس میں سے بغچیاں اور پوٹلیاں نکالکر اپنے سامان میں بھر رہے تھے۔ اتنے میں پردھان جی افسردہ اور خاموش آکے ان کو اس طرح مصروف دیکھ کر کچھ کہنے کو تھے کہ جیوناتھ بھگت نے آنکھ کے اشارے سے انکو بھی بلایا اور دو ایک پوٹلیاں انکو بھی تھمادیں، پردھان جی مطمئن ہو کر اپنا حصہ لئے ہوئے کمرے کی طرف پھر چلے گئے۔

سب کے آخیر میں تاجور سامری اور کوی پرکاش اپنے سامان کے ساتھ لاریوں پر بیٹھے ایک ایک مسلح سپاہی بھی ساتھ تھا۔ لاریاں چلیں۔ نہر کے کنارے کنارے سے بھولا ناتھ کی کوٹھی کے پاس سے ریل بازار کے سامنے سے کمپنی باغ جانیوالی سڑک کو راستے میں پناہ گزینوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ فٹ پاتھوں پر حیران کھڑے تھے لاریاں آگے پیچھے ایک قطار میں تیزی سے لائلپور کے چمن کی اصلی رونق کو اپنے میں بھرے اس طرح جارہی تھیں جیسے میونسپلٹی کی گندگی کی لاریاں کوڑا کرکٹ بھر کر شہر سے باہر لیجاتی ہے۔ کوڑا کرکٹ، ہاں اب یہ بےبس اور بے گھر شہری جو اپنے گھر ہی میں شرنارتھی تھے۔ وہ گھر جسکو انہوں نے اپنے خون پسینے سے دنیا کا خوبصورت ترین شہر بناکے رکھدیا، آج وہ اسے چھوڑ کر کوڑے کے ڈھیر میں شامل ہونے جارہے تھے جو پاکستان بننے کے بعد شہر سے باہر ایسے ہی لوگوں کو جمع کرکے بنادیا گیا تھا۔ تاجور سامری اداس اور حسرت کی نظروں سے ——— اپنے چاروں طرف دیکھتا جارہا تھا۔ کمپنی باغ میں پاکستان لائلپور کے ہونیوالے شہری بھرے پڑے تھے۔ بے سروسامانی اور مظلومی کی تصویر، تاجور سامری اپنے آپ سے کہ اٹھا۔ اس حالت کو پہنچا ہوا آدمی جو آدمی نہیں وحشی ہو جاتا ہے۔ اگر درندوں اور بربروں کے سے کام کرتا ہے تو اسکا کیا قصور؟ یہ بچارے تو سامراج کے ایجنٹ بے ایمان لیڈروں کی کٹھ پتلیاں ہیں۔ اچانک لاریوں کا یہ قافلہ رک گیا اور تاجور سامری کا خیالی سلسلہ

ایکدم ٹوٹ گیا۔ اب وہ آریہ سکول پناہگزین کیمپ کے سامنے تھا۔ سنگھ کے رضاکار سامان اتار رہے تھے۔ اس کیمپ میں پہلے کے آنیوالے بھی وہیں موجود تھے۔ بے پناہ رونق۔ ایک نئی قسم کی زندگی کا احساس آنیوالے کو ہوتا تھا۔ تاجور سامری ایکمرتبہ تو شہر سے نکلنے کا غم بھول گیا۔ بلوچی فوجی جیپوں پر گشت لگا رہے تھے۔ انکی خاکی انگریزی ٹوپیاں انکے ماتھوں پر جھکی ہوئی تھیں۔ لیکن انکی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک نظر آتی جو غور سے دیکھنے کے بعد خوفناک معلوم ہوتی، سامان اتارا جاچکا۔ سب نے اپنا اپنا سامان اٹھایا بیبیوں کا سامان اتارنے والے سیوک نظر بچا کر خرد برد کرچکے تھے۔ لیکن وہاں کون کسی کی فریاد سنتا۔

تاجور سامری کوی پرکاش۔ اور ان کے ماں باپ بھی اپنا بوریا بندھنا اٹھاکر جگہ کی تلاش میں گنجان آباد کیمپ کی روشوں سے گزرنے لگے۔ تقریباً سبھی چہرے جانے پہچانے نظر آتے تھے۔ ایک طرف ہسپتال بھی تھا۔ بورڈ پر ادشٹھالیہ لکھا تھا۔ بھیڑ بھی بیماروں کی خاصی جمع تھی، یہ سب پھر پھراتے اناتھ آشرم سے ملتے ہوئے پلاٹ میں مقیم ہوئے۔ ہر طرف چادروں اور کھیسوں کو لاٹھیوں پر ڈال کر تمبو بنائے گئے نظر آتے تھے۔ شام ہوچکی تھی۔ ہر طرف کھانا پکانے کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ تاجور سامری اور اسکے ساتھیوں نے بھی ایک مناسب جگہ منتخب کرکے ڈیرا جمایا۔ اسکی ماں چولہے چوکے کی طرف متوجہ ہوئی کرپا رام لاغر پانی کے لئے بالٹی لے کر چلدیئے تاجور سامری تھکاہارا ایک طرف لیٹکر دن بھر کے واقعات پر رائے زنی کرنے لگا۔ اسی دوران میں رام لال۔ رام لبھایا اور انکی بیویاں بچے بھی آگئے۔ اب یہ ڈیرہ مشترکہ ہوجانیسے فدا بڑا ہوگیا ایک چولہے کی جگہ تین تین جلنے لگے۔ دن ڈھل گیا تھا۔ لیکن کرپا رام لاغر پانی لیکر نہیں لوٹا تھا تاجور سامری ماں کے کہنے پر پمپ کی طرف گیا۔ وہاں پانی لینے والوں کی ایک دو فرلانگ لمبی لائن نظر آئی۔ اسکا والد ابھی بہت دور تھا۔ بڑے انتظار کے بعد انکی باری آئی۔ لوگ ذرا سی بات پر

لڑتے گالیاں بکتے اور ایک دوسرے سے گتھ جاتے۔ اندھیرا ہو گیا تھا جب یہ ڈیرے لوٹے۔ اتنے میں باہر کی طرف بھاگڑ مچ گئی لوگ بے تحاشا ادھر بھاگے۔ لیکن جلدی ہی اس ہراس پر قابو پا لیا گیا۔ پتا چلا کہ چند عورتیں رکنے کے باوجود حد سے آگے جا کر بھٹے کے گڑھوں میں رفع حاجت کو چلی گئی تھیں۔ گھات میں بیٹھے گنڈے انمیں ایک جوان لڑکی کو لے بھاگے۔ تھوڑی دیر خوب ہلڑ مچا رہا سنگھ کے سیوک اور دوسرے والنیٹر لاٹھیاں لیکر ادھر لپکے۔ اسکے بعد اسکے متعلق کچھ پتا نہ چلا۔ اور یہ نیا ڈیرا اور نیا ماحول اس چھوٹے سے گھرانے کو بہت بھایا۔ چاندنی رات اور ٹھنڈی ہوا نے خوب رنگ جمایا۔ ایسے سوئے کہ صبحکو سورج نکلے تاجور سامری کی آنکھ کھلی، پاس ہی ایک بڑھیا گالیاں بک رہی تھی کہ نہ جانے کون موا اسکے چوکے میں ہگ گیا۔ ارتھی نکلے کمبخت کی، اسپر پاس ہی سی ایک عورت شعلے کی طرح لپکی اور جھپٹ کر بولی تری ارتھی نکلے۔ ترے ہوتے سوتے کی ارتھی نکلے۔ تو کون ہوتی ہے۔ میری ارتھی نکلوانے والی۔ بس اب کیا تھا۔ خوب لم تم مچی۔ تاجور سامری اس جھگڑے سے اوب کر اپنے باپ اور بھائی کے ساتھ رفع حاجت کو چلدیا۔ کیمپ کے منتظمین نے ایک ریتیلے میدان میں انتظام کر رکھا تھا۔ بیشمار لوگ آجا رہے تھے۔ پہلی بار تاجور سامری کو احساس ہوا۔ جیسے وہ ایک بہت بڑی سنڈاس میں گر پڑا ہو۔ دور تک غلاظت اور رفع حاجت کرتے ہوئے لوگ، یہ ریگستانی وسیع میدان اب واقعی ایک لمبی چوڑی سنڈاس بنکر رہگیا تھا۔ والنیٹر بعض نزدیک ہی بیٹھ جانیوالوں کو پیٹ رہے تھے۔ اور تاجور سامری چاروں طرف دیکھتا ہوا یہ سوچتا بیٹھ گیا۔ یہ وہی میدان ہے جہاں وہ بیسیوں بار آیا۔ دیر ہو سویر بے خطر آیا۔ اور سامنے مائی کی جھگی کا گوردوارہ جو ایک برہمچاری ہندو عورت نے بنوایا تھا۔ وہاں نہ جانے کتنی بار آ چکا تھا۔ مگر آج اسے ہر طرف ایک خوف ایک بے اعتمادی چھائی نظر آتی تھی۔ اب وہ ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتا تھا۔

رفع حاجت سے نبٹ کر سب گھر لوٹے۔ نہانے دھونے کھانے پینے سے فارغ ہو کر تاجور سامری کیمپ کی سیر دیکھنے نکلا، حالانکہ بہت سے لوگ شہر چھوڑ چکے تھے۔ لیکن ہر طرف اتنی جانی پہچانی صورتیں نظر آرہی تھیں کہ وہ بات ایک پراپیگنڈا اسسٹنٹ جان پڑتی تھی۔ بدھو رام سُنار جس نے ساری عمر زرگری سے لپٹے رہنے کے بعد اچانک طبیب کی جون اختیار کر لی تھی۔ ایک بڑی شیشم کے سائے میں اپنا دواخانہ قائم کئے بیٹھے تھے، دکان پر خاصی بھیڑ نظر آتی تھی۔ گاہکوں میں زیادہ تر اجنبی تھے۔ ریل بازار کے باہر گرجا گھر کے پاس پیپل تلے والا برہمچاری بھی ایک طرف اپنا اڈا جمائے نظر آیا، کئی بیفکرے جمع تھے۔ سلفے اور بھنگ کے دور چل رہے تھے۔ دوار کا بھون ٹالے پر دھان جی ایک اجڑے سے آم تلے سر جھکائے اسطرح بیٹھے تھے جیسے کوئی معزول بادشاہ کسی جزیرے میں نظر بند ہو۔ تاجور سامری ان سب کو خاموشی سے دیکھتا سکول کی عمارت کے پاس سے گزرا، یہ عمارت اب کیمپ کے ہیڈ کوارٹر میں بدل چکی تھی۔ اور اس کے کمروں پر جہاں پہلے پڑھنے والوں کی ملی جُلی آوازوں سے ایک خوشگوار چہل پہل رہتی تھی۔ اب سنگھ کے کرمچاری قابض تھے۔ کئی کمرے سامان اور فرنیچر سے بھرے پڑے تھے۔ جو دفتری کاروبار کے لئے استعمال ہوتے تھے ان کے دروازے بھی بند تھے۔ تاجور سامری اب دروازے کے پاس آچکا تھا۔ اسکے پاس دائیں طرف ایک بھیڑ تھی اور بدھو سُنار جو اب طبیب بن چکے تھے۔ اور جن کا دعویٰ تھا کہ طب و حکمت میرے خاندان میں آٹھ پیڑیوں سے ہے۔ ان کا بڑا لڑکا مجمع بازی کر رہا تھا۔ ایک لڑکا جس کے منہ پر کپڑا پڑا تھا زمین پر لیٹا تھا اور عامل کہہ رہا تھا۔ تو کون! زمین پر بیہوش پڑا لڑکا جواب دیتا۔ معمول۔ پھر سوال ہوتا، میں کون؟ جواب ملتا عامل، عامل صاحب! ایک چکر مجمع کا لگا کر یہ پوچھتے، جو کچھ میں پوچھونگا بتاؤ گے؟ معمول کہتا، ضرور۔

عامل صاحب ایک کتاب پر انگلی رکھکر پکارتے، لڑکے بتاؤ یہ کیا ہے؟

معمول، کی طرف سے کوئی جواب نہ ملتا۔

عامل صاحب گھبراہٹ کو چھپا کر بھروسے کے انداز میں پھر اپنا سوال دہراتے! میں پوچھتا ہوں یہ کیا ہی لڑکے؟

معمول، گھبرا کر جواب دیتا، یہ تو آپ نے مجھے نہیں بتایا۔

اس پر مجمع میں قہقہوں کی رو دوڑ گئی۔ اور عامل صاحب جھلائے سے بھیڑ میں گھسنے کی کوشش کرنے لگے۔

تاجور سامری ادھر سے ہٹا تو دروازے کے پاس ایک آشنا صورت کو اپنا منتظر پایا۔

تاجور! ادھر آؤ، اجنبی کہہ رہا تھا۔

اوہ! چودھری صاحب! آپ یہاں کہاں؟ تاجور سامری لپک کر اس شخص سے لپٹ گیا

چودھری صاحب نے آنکھوں میں آنسو لئے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ آخر وہی ہوا تاجور! جو تم کہتے تھے۔ واقعی یہ پاکستان جو ہمیں مل رہا ہی ہمارا خواب نہیں تھا، بھائی تم کیوں یہاں آ پھنسے! مجھے کل دوارکا بھون میں تم پر حملے کی اطلاع ملی تھی۔ سٹپٹا کر رہ گیا۔ کچھ بن نہ پڑتا تھا وہ تو اچھا ہوا کہ شیخ صدیق پولیس کو لیکر وہاں پہنچ گئے۔

تاجور سامری نے کہا۔ صدیق صاحب میرے اور میرے مظلوم ساتھیوں کے لئے فرشتۂ رحمت تھے۔" پھر اب کیا ارادہ ہی، میرے ساتھ چلتے ہو؟ ——— مجھ پر بھروسا کرکے دیکھ لو، تاجور، تم یقیناً مجھے اچھا آدمی سمجھتے ہو"، چودھری صاحب نے تاجور سامری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر کہا، "بیشک میں نے آپ کو ہمیشہ ایک انسان سمجھا ہی لیکن اب جبکہ آپ جیسے لوگوں کی تعداد کم ہی۔ آپ کی طاقت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ابتو مجھے دعائے خیر سے رخصت کیجئے۔ چند دنوں میں ہمارا کوئی نہ کوئی انتظام ہو ہی جائیگا" تاجور سامری نے

اور اونگھتے ہوئے بھدے سردار جی کسی پرانے درخت کی طرح تاجور سامری پر آگرے، وہ اس ناگہانی آفت سے بھنّا سا گیا۔ اور غصّے سے بولا۔ سردار جی ذرا ہوش سے کام لیجئے۔ میرا تو کچومر نکال دیا آپ نے؟ وہ ابھی تک کھا جانے والی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا اور سردار جی اس طرح جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، اپنے ڈاڑھی اور مونچھوں سے بھرے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار پیدا کر کے بولے۔ بھائی آپ ناحق ناراض ہوتے ہیں آپ کو تو معلوم ہی ہے بھلا یہ وقت اور ہم میں ہوش؟ یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی کلائی کی گھڑی تاجور سامری کی آنکھوں سے لگا دی۔ اس سے اچانک اس کا بھڑکا ہوا غصّہ سرد ہو کر دھیرے دھیرے مسکراہٹ میں بدل گیا۔ اور وہ دل ہی دل میں اپنی حرکت پر شرم سار ہونے لگا۔ کیوں کہ گھڑی کی دو سوئیاں بارہ کے ہندسے پر پوری طرح چھا رہی تھیں۔ تاجور سامری کا بدلا ہوا رویّہ دیکھ کر وہ مسکرا کر بولے کیوں جی اب بھی یہ ناراضگی رہے گی؟۔

تاجور سامری بولا آپ جیسے زندہ دل انسان سے کوئی ناراض ہو سکتا ہے چھوڑیئے اب اس قصّے کو۔ کوئی نئی بات کہیئے۔ مگر مجھے اس امر کا بہت افسوس ہے کہ آپ کھڑے ہیں اور میں بیٹھا ہوں۔ بہتر ہو کہ اب آپ میری جگہ پر آجائیں۔ تاکہ اطمینان سے باتیں ہو سکیں۔ سردار جی نے اُسے ہٹاتے ہوئے کہا۔ آپ تکلیف نہ کیجئے۔ آپ کی جگہ اور میں؟ ذرا کچھ خیال کیجئے۔

تاجور سامری اس پر مسکرا کر رہ گیا۔ یہ شیخ پورہ جنکشن تھا۔ ساری گاڑی میں ایک ہل چل مچی ہوئی تھی اترنے والوں نے سب کو پریشان کر رکھا تھا۔ اس ڈبّے میں اب دھیرے دھیرے مطلع صاف ہونے لگا تھا امید کے خلاف سوار ہونے والے بہت کم نکلے۔ چنانچہ خان صاحب اور شیخ جی کے پاس خاصی جگہ دیکھ کر سردار جی اور تاجور سامری اس

بھروسے کے انداز میں کہا،

آپ بھولتے ہیں تاجور صاحب! آپکا یہاں سے بچ نکلنا ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور ہی! مجھے پتا چلا ہی کہ آج یہ پلٹری آپ پر حملہ کر دادے گی۔ غضبناک پناہگزینوں کو اشتعال میں لاکر یہاں میل بھر کے فاصلے پر جمع کیا گیا ہی۔ بس رات ہوتے ہی ....

اس سے آگے وہ بول نہ سکے، تاجور سامری خوف اور مایوسی کے عالم میں چودھری کو دیکھتا رہ گیا۔ چودھری نے پھر کہا۔ ابتو چلو میرے ساتھ مجبوراً آپ بالکل اجنبی ہیں۔ جو جلتے ہیں وہ دشمن نہیں کم از کم حالات سدھر گئے تو رہ جایئے گا ورنہ میں آپکو ہندوستان پہنچانیکا انتظام کرا دونگا۔

تاجور سامری نے مایوسی کے انداز میں جواب دیا۔ چودھری صاحب اسکے باوجود مجھے معذور سمجھئے میں اپنے ماں باپ بھائی کو نہیں چھوڑ سکتا، وہ ہرگز آپکے ساتھ چلنے کو رضامند نہ ہونگے۔

پھر آپ کو مرنے دوں۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ چودھری صاحب رندھی آواز میں بولے

تاجور سامری خاموشی سے زمین کو پاؤں کے انگوٹھے سے کریدنے لگا۔

چودھری صاحب نے پھر زبان کھولی، اچھا ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہی اگر اس پر عمل ہوا تو آپ سب بچ جائیں گے وہ یہ کہ نو بجے سے پہلے ہی آپ اسکول کی عمارت میں گھس جائیں آپ کے آگے پیچھے کم از کم بیس دیواریں آدمیوں کی ہوں، سامان کا موہ نہ رکھیئے گا، روپیہ زیور اگر ہے تو کمر سے باندھ لیجئے گا۔

تاجور سامری نے پر امید لہجے میں جواب دیا۔ یہ ترکیب قابل عمل بھی ہی۔ اور مناسب بھی۔ اچھا اب آپ جایئے۔ لوگ آپ کو مشتبہ نظروں سے گھور رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کوئی جاہل آپ کی طرف انگلی بھی اٹھائے۔

چودھری صاحب پھر تاجور سامری سے بغلگیر ہوئے اور تاکید کرکے رخصت ہو گئے۔

تاجور سامری امید و بیم کے درمیان گھسا پٹا ڈیرے کو لوٹا۔ رستے سے وہ پھر پلٹا۔ اس کے

ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ تنگھ والوں کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ ایک کمرے کے سامنے جا کر رک گیا۔ جہاں کیمپ انچارج کا بورڈ لگا تھا۔ ایک کالے سے درمیانے قد کے آدمی نے جس کے چہرے سے فریب پھٹا پڑتا تھا۔ چھوٹتے ہی سوال کیا، تو کیا چاہتا ہے!

تاجور سامری نے جواب دیا۔ کیمپ انچارج سے ملنا چاہتا ہوں!

کیا کام ہے! اُس شخص نے آنکھوں کو مکارانہ انداز سے گردش دیکر کہا "اُنہی سے کہوں گا" اتنا ضروری کام ہے وہ نہیں مل سکتے اسوقت۔ یہ فقرہ اُسنے بلکر زور سے کہا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک موٹا سا لالہ نما شخص خاکی پینٹ پہنے باہر نکلا۔ پوچھا کیا بات ہے!

وہ کالا سا آدمی تاجور سامری کو حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ یہ آپ کا وقت ضائع کرنا چاہتا ہے۔ تاجور سامری نے خود ہی کہنا شروع کیا۔ وقت کی قدر تو آپ جانیں میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ آج بلوچ ملٹری یہاں حملہ کرا دیگی۔ مجھے ایک نہایت معتبر شہری نے اطلاع دی ہے۔ آپ اگر انتظام کر سکتے ہوں تو دیر نہ کیجئے۔

میں سب کچھ جانتا ہوں، تم بیفکر رہو۔ یہاں سب انتظام ہے۔ یہ کہہ کر وہ پھر اندر گھس گیا۔ اور دروازہ بند ہو گیا۔ تاجور سامری مایوس ہو کر ڈیرے کو چلا آیا۔

سارا دن رام لال رام لچھیا۔ اور کرپا رام لاغریں اس موضوع پر بحث ہوتی رہی کہ آیا یہ حملہ کی اطلاع درست بھی ہو سکتی ہے کہ نہیں۔ عورتیں سبھی تاجور سامری سے متفق تھیں۔ رام لال کا بڑا لڑکا کشور اپنے ہنگی ساتھیوں سے پہلے ہی یہ خبر سنکر آیا تھا۔ وہ حملہ روکنے اور حملہ آوروں کو پسپا کرنے کی تجویزیں بناتا رہا۔ جو اسے اپنے سنچالک سے ملی تھیں اور کوی پرکاش ایکطرف بیفکری سے بیٹھا گیت کی فکر میں غرق تھا، دن ڈھل گیا۔

رام لال نے بڑے مدبرانہ انداز میں آنکھیں زمین پر گاڑ کر کہا۔ بڑے افسوس کی بات ہے یہ لوگ کسی معاہدے پر قائم نہیں رہتے، حالانکہ مجھے پتا چلا تھا جناح نے نہرو سے یہ طے کیا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد کہیں کسی کو نہ ستایا جائے گا، میرا خیال ہے یہ حملہ وغیرہ یار لوگوں کی گھڑنت ہے، پریشانی

اور دہشت پھیلانے کے سوا۔ میں سمجھتا ہوں اس افواہ کا نتیجہ اور کچھ نہ ہوگا۔

لاغر صاحب نے بھی رام لال کی یوں تائید کی کہ مسلمان تو اب یوں بھی ہندوؤں سے نہیں لڑینگے، کیونکہ اسکا اثر سیدھا ہندوستان کے مسلمانوں پر پڑیگا۔ مجھے یقین ہے یہ حملہ وملہ واقعی ہمیں خراب کرنے کا بہانہ ہے۔ شرارتی لوگ ....

رام لُبھایا، بات کاٹ کر بولے، مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔ فوج اب پہلے کی سی نہیں رہی اُن کو مذہب کے نام پر خوب بھڑکایا ہے۔ سارے پنجاب میں فساد کی آگ کو دوبارہ بھڑکانے میں فوج نے بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ کیا عجب یہ بلوچ فوجی کوئی شرارت کر ہی دیں۔ میری رائے میں اپنے بچاؤ کا انتظام کر لینا چاہیے۔ تاجور کے دوست نے درست ہی اطلاع دی ہوگی۔

رام لال گرم ہو کر بولا۔ تم سب ڈرپوک ہو۔ مجھ پر ذمہ داری چھوڑ دو جاؤ، اور بے خوفی سے اپنا کام کرو۔

تاجور سامری کی ماں بھی کھانا تیار کر کے انکے پاس آ بیٹھی۔ کشور کی ماں اور رام لُبھایا کی بیوی بھی ڈری ڈری سہمی سی ان کے پاس دبکی پڑی تھیں۔ رام لال کے اس حوصلہ افزا اعلان سننے کا اُن پر کوئی اثر نہ پڑا۔ کرپا رام لاغر اس ماحول سے اُوب کر کھانے میں جُٹ گیا اور دوسرے لوگ بھی کھانا کھانے لگ پڑے۔

رات دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی غالباً نو بجے ہونگے، کہ اچانک اناتھ آشرم کیطرف سے گولی چلی یہ ایک متوقع بات تھی، کیمپ میں گھبراہٹ کے آثار نمودار ہونے لگے۔ والنیٹر تیار ہو کر چاروں طرف کیمپ کی سرحدوں پر چھا گئے۔ اب رام لال نے اچانک پہلو بدلا۔ اور چلا کر کہنے لگا، تاجور ٹھیک کہتا تھا، حملہ ہونیوالا ہے۔ چلو بھاگو سکول کی طرف۔ یہ سنکر پڑوس کے ڈیرے داروں میں بھی ہراس پھیل گیا۔ اس کے بعد ایک گولی ادھر چلی۔ اب ہراس اور انتشار اور بڑھ گیا۔ لوگ اپنی جگہوں سے اُکھڑنے لگے۔ ادھر سرحدوں سے امداد کی پکار اُٹھی۔ تاجور سامری کشور۔ اور کوئی پرکاش جوش میں آکر کھیس اور دوپٹے سروں سے لپیٹ لٹھ ہاتھوں میں لئے

ادھر پکے، عورتیں روتی رہگئیں لیکن یہ مجاہد میدان میں اتر چکے تھے۔

چاند اب چھان گاؤں کے درختوں کے جھرمٹ سے نکل آیا تھا۔ آوے کے سائے زمین پر لیٹ کر غائب ہو چکے تھے۔ تاجور سامری اور کوئی پرکاش کیمپ کے بچاؤ کے دستے میں شامل حملہ آوروں کے دور سے آنکے سنائی دیتے ہوئے نعروں کا شور سن رہے تھے۔ اناتھ آشرم کی نکڑ پر بلوچ ملٹری کے دو جوان سٹین گنیں لئے کھڑے تھے۔ شور اور بھی قریب آگیا۔ کیمپ کے والینٹر جو ڈیفنس کے لئے سرحدوں پر جمع تھے۔ ہشیار ہو گئے۔ سرحدوں کے اندر بے پناہ شور پریشانی بھگڈر اور افل تھل کا عالم تھا۔ گرد و غبار میں سوائے شور کے اور کچھ نہیں سوجھتا تھا اچانک سب چیت گئے آوے کے سامنے کا وسیع میدان حملہ آوروں سے بھر پور لگا۔ نہ جانے کہاں سے لشکر دوڑا چلا آرہا ہے۔ تکبیر اور یا علی کے نعروں سے آسمان گونج رہا تھا۔ برچھیاں، بھالے، تلواریں چھرے اور بھاری لوہے کے ساموں والے لٹھ، بے تابی سے چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ کیمپ والوں نے اینٹوں اور پتھروں سے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو آدھ فرلانگ پر روک دیا۔ ایک موٹا سا بوڑھا کیمپ والوں کے پرے سے برچھا چمکاتا ہوا۔ حملہ آوروں پر لپکا۔ اس سے دوسروں کے حوصلے بھی بڑھے حملہ آور اتنے ہجوم کو اپنے مقابلے پر دیکھ کر گھبرا گئے وہ ایک دم رک گئے۔ برچھے والا بڈھا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک ایک بلوچی سپاہی کی گولی نے اُسے وہیں ٹھنڈا کر دیا۔ حملہ آور اور بھی گھبرائے اور اپنا رُخ مائی کی جھگی کیطرف پھیر دیا۔ ڈیفنس کے والنٹیروں میں بھی بھاگڑ مچ گئی۔ لیکن تاجور سامری ایک طرف مبہوت کھڑا تھا ایک سخت سی چیز اس کی پنڈلی کو زخمی کر گئی لیکن وہ چپکا اس عجیب نظارے کو دیکھتا رہا۔ اچانک کوئی پرکاش نے پکارا۔ تاج بھیا، تاج آجاؤ۔ اب وقت نہیں رہا۔ بھاگ آؤ۔ اسکے ساتھ ہی تاجور سامری کی ماں کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس بھگدڑ کے عالم میں اسے تلاش کر رہی ہے۔ تاجور سامری اب نہ رُک سکا۔ اور اپنے ڈیرے کی طرف چلا لیکن اب وہاں نقشہ ہی اور تھا۔ سبھی سائبان اور تنبو زمین پر برابر

ہو چکے تھے۔ کوی پرکاش نے اسے دیکھ کر پاس بلا لیا۔ اتنے میں اس کی ماں بھی آگئی جو واقعی تاجور سامری کو ڈھونڈنے نکل گئی تھی۔ ماسی شاہنی اپنے لڑکے کشور کو پکار رہی تھی۔ وہ نہ جانے حملہ ہوتے ہی کہیں گم ہو گیا تھا۔ دراصل تاجور سامری کو اس وقت کوئی بھی سنگھ کا کارکن نظر نہیں آیا تھا۔ رام لال کہہ رہا تھا۔ تم سب بیوقوف ہو میں کہتا تھا نا مسلمانوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ ضرور دغا کریں گے۔ بے ایمان کہیں کے، اُسے اپنی جان کے خوف سے چوڑی سی چڑھتی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ احمق نہ بنو جلدی چلو۔ کشور آ ہی جائیگا بچہ تھوڑی ہے وہ۔ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔ چلو ——— چلو۔ ماسی شاہنی رو رہی تھی وہ کیمپ کی سرحد پر جانا چاہتی تھی مگر رام لال اسے آگے کو دھکیلے جاتا تھا۔ کرپا رام لاغر اپنی دوہتی لبھی کا ہاتھ پکڑے ایک طرف کھڑا تھا لبھی کچھ نیم دیوانی سی کمسن لڑکی تھی۔ وہ اس قیامت کے عالم میں بھی مطمئن کھڑی چاندنی کو گھور رہی تھی۔ آخر شاہنی کو بیٹے کی محبت کو شوہر کی فرماں برداری پر قربان کرنا پڑا اور سب تیزی سے چل پڑے رام لبھایا کی بیوی اپنے بچوں کو سنبھالے آگے جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے رام لال شاہنی اسکی لڑکی اور چھوٹے لڑکے کرپا رام لاغر بھی اور کوی پرکاش تاجور سامری اور سب کے پیچھے تاجور سامری کی ماں۔ اسی ہزار کی یہ گنجان آبادی ایک فرلانگ بھر جگہ سکول کی بلڈنگ کے سامنے سمائی جا رہی تھی۔ ایک محفوظ جگہ پر آکر یہ سب رک گئے۔ ماسی شاہنی ابھی تک رو رہی تھی۔ بین کر رہی تھی۔ کشور کو پکار رہی تھی اور ادھر مائی جھگی کی طرف والے پلاٹ میں قیامت برپا ہو رہی تھی۔ گولیاں تڑتڑ دانوں کی طرح جانداروں کو بھون رہی تھیں حملہ آوروں کے تیز اور چمکیلے ہتھیار کافروں کے سینوں میں جگہ پا رہے تھے۔ کہنے کو گولوں کی روشنی سے مقصد دشمن کو پہچاننا ہی لیکن دراصل اسی روشنی میں نوجوان خوبصورت کنواریوں کی تلاش تھی۔ مال اور دولت کی جستجو تھی اس حصے میں لائلپوری دیہات کے امیر ترین لوگ جمع تھے بلوچ ملڑی نے حملہ آوروں کو یہ خبر پہنچا دی تھی۔ وہ بھلا کیونکر برداشت کر سکتے تھے کہ پاکستان کی دولت کو کافر ہندوستان لے جائیں جبکہ وہ

اپنے گھروں سے نکلتے سمے پھوٹی کوڑی بھی نہ لا سکے تھے۔ سکھ فوجیوں اور سنگی رضاکاروں نے انکے دانتوں کے سنہری خول تک اتار لئے تھے۔ ہر طرف ایک کہرام مچا تھا۔ چیخ پکار شور شرابا دڑ تڑ ٹھائیں ٹھائیں کی آوازیں ایک قیامت کا سماں پیدا کر رہی تھیں۔ بعض درد مند جیالے اس آگ میں کود رہے تھے اور دوسروں کو غیرت دلاتے ہوئے اپنے ساتھ کودنے کے لئے اکسا رہے تھے۔ تاجور سامری اور کوئی پرکاش سے ان کی ماں بری طرح چمٹی ہوئی تھی اور شاہنی ابھی تک روتی بین کرتی دیوی دیوتاؤں کی منتیں مانتی اپنے جوان لڑکے کو پکار رہی تھی۔ رام لال اپنے تدبر اور سیاست کا اظہار ایک شاہ پور ضلع کے دیہاتی سے کر رہا تھا۔ کرپا رام لاغر بنسل کا غذ لئے چاند کی روشنی میں فکر سخن کر رہا تھا۔ ایک طرف ایک لالہ جی ایک سابق صراف سے سونے چاندی کے بھاؤ کے اتار چڑھاؤ پر تبصرہ کر رہے تھے۔ اور صراف صاحب دھیرے دھیرے کہہ رہے تھے میں نے جتنا شہر میں چھوڑا ہے اس سے کئی گنا سستے داموں سونا چاندی خرید کر کما لیا ہے، ایک طرف چند بھگت جن اپنے درمیان ایک پنڈت جی کو لئے بھگتی بھاؤ اور پریم رس کی گنگا بہا رہے تھے۔ پنڈت جی بھگوت گیتا کا پاٹھ کر رہے تھے۔ اپنے سننے والوں کے دلوں سے موت اور تباہی کے خوف کو نکال رہے تھے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ جاتے تھے بھگوان سدرشن دھاری اب تیرا قول نبھانے کا وقت ہے۔ آ دیکھ کہ تیرے پیارے بھگتوں پر ملیچھ کیا کیا اتیاچار کر رہے ہیں دہرم کی نیا کس طرح بھنور میں ڈگمگا رہی ہے۔ اور ادھر بدستور قیامت مچی تھی۔ ہائے وائے۔ آہ کے شور سے آسمان کانپ رہا تھا۔ آدمی پر آدمی چڑھا جاتا تھا۔ عورت مرد، برے بھلے اور اونچ نیچ کی تمیز بظاہر نظر نہیں آتی تھی۔ سب بھیڑ بکری کی طرح ایک ہی جگہ بھرے پڑے تھے۔ ہون شالا میں کنڈ کے پاس بھی کھسر پھسر جاری تھی۔ تاجور سامری ہون شالا کے چبوترے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ آواز جانی پہچانی محسوس ہوتی تھی۔ میرا کہنا نہیں مانو گی، ہرش بہن جی کو تو اب مرکھپ گئی سمجھو، میرے ساتھ چلنا مرنے ہی مرنے ہیں۔ سنا!

ائے! جیونا بھگت! ہرش! یہ کیا گول مال ہے تاجور سامری یہ معلوم کرنے کے لئے اٹھا لیکن اسکی ماں نے فوراً اسے بٹھا لیا۔ اب یہ چیخ پکار کا شور مدھم پڑنے لگا خاموشی بھی تھم گئی تھی

روشنی کے گولے اب نہیں پھٹتے تھے۔ بھاری بھرکم فوجی لاریوں ٹرکوں کی آمد و رفت البتہ ابھی جاری تھی۔ لوگوں نے سمجھا امن ہو گیا۔ چنانچہ دھیرے دھیرے یہ بھیڑ پھیلنے لگی۔ تاجور سامری اور اسکے ساتھی بھی اس گھٹی ہوئی جگہ سے نکل کر کھلی جگہ پر آ بیٹھے تھے۔ کوی پرکاش نے کہا۔ میرا خیال ہے سامان کی سُدھ لے آئیں۔ بچا بھی ہی کچھ کہ گیا سب کچھ ؟۔

رام لبھایا نے اسکی تائید کی۔ اب تاجور سامری کی ماں بھی خاموش رہی ——— چنانچہ تاجور سامری۔ کوی پرکاش اور رام لبھایا تینوں اپنے ڈیرے کی طرف چلے وہاں پہنچنے میں انہیں کوئی خاص دیر نہیں لگی۔ کیونکہ راستہ اب سیدھا اور صاف تھا انکے سامان کا ڈھیر جوں کا توں پڑا تھا۔ کوی پرکاش نے لپک کر اپنا کوٹ اٹھالیا اور جلدی سے جیبیں ٹٹولیں اور خوش ہو کر بولا، میرے روپے مل گئے۔ رام لبھایا بولا۔ میری چیز بھی مل گئی۔ تاجور سامری بولا۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے سامان کو کسی نے چھوا تک نہیں۔ آؤ چلیں واپس۔ تینوں ایک مسرت کی ترنگ میں لپکے ہوئے اپنے ساتھیوں سے آملے۔ سب نے یہ خوشخبری سنی۔ اور مطمئن ہو گئے لیکن شاہنی کے آنسو تھمتے نہ تھے وہ کشور کے لئے بین کر رہی تھی، دوسری عورتیں اگرچہ اسے دلاسا دیتی تھیں مگر اُسپر کسی کی ایک بھی بات اثر نہیں کرتی تھی، اب بالکل امن کا عالم تھا۔ جو جہاں تھا وہیں بیٹھا صبح کا منتظر تھا۔ اچانک تین بلوچی فوجی پراسرار طور پر ان کے پاس آکر رک گئے۔ سب کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ سکتے اور خوف کے عالم میں ان کو دیکھ رہے تھے۔ ایک لحیم شحیم اونچے قد کا بلوچ صوبہ دار اسی قد قامت کے سپاہی۔ رائفلیں تانے۔ صوبہ دار کے کاندھوں کے فوجی عہدے کے نشان صاف نظر آرہے تھے وہ پھول اور اس کے ہاتھ میں پستول، رام لال پر ڈر کے مارے بیہوشی چھانے لگی۔ صوبہ دار نے لپککر کوی پرکاش کو پکڑ لیا اور کہا چلو ——— کوی پرکاش گھبرا کر بولا۔ کہاں۔ صوبہ دار نے کڑک کر کہا، بکواس کرتا ہی آگے سے ——— اور اسے آگے کو دھکیلا۔ تاجور سامری کی ماں بھوکی شیرنی کی طرح لپکی اور اس بھاری بھرکم فوجی کو جھنجوڑ کر بولی۔ بھیڑیئے کہاں لئے جاتا ہی۔ میرے

بچے کو، پہلے مجھ سے تو نبٹ یہ کہہ آنِ واحد میں اس صوبہ دار کے ہاتھ پر جھپٹ کر پستول چھین کر ایک طرف پھینک دیا، اور کہا تم فوجی ہو! تمہارا کام ہماری حفاظت کرنا ہے! نہ کہ مارنا! بے حیا و شرم کرو، نہ جانے ان الفاظ نے یا اس کی بہادری نے ان فوجیوں کو خاموش کر دیا۔ صوبیدار نے چپکے سے بڑھکر اپنا پستول اٹھا کر خول میں ڈال لیا پھر ایک طرف بیٹھے تاجور سامری کو جا پکڑا! ابھی وہ اٹھا ہی نہ تھا کہ اس کی ماں پھر گرجی! میں کہتی ہوں بھیڑیو! بھاگو یہاں سے۔ اور صوبیدار کانپ کر کہنے لگا۔ یہ بھی تمہارا لڑکا ہی مائی!

ہاں میرا لڑکا ہی۔ سبھی میرے لڑکے ہیں۔ تاجور سامری کی ماں نے بیخوفی اور پُراثر لہجے میں جواب دیا۔

تینوں فوجی موٹریوں کی طرح دُم دبائے ایک طرف ہجوم میں غائب ہو گئے۔

اس منظر نے آس پاس کی بجھی ہوئی روحوں کو پھر روشن کر دیا اور لوگ آپس میں آنیوالی صبح کے خوشگوار تصور میں کھو گئے چاند پچھم میں جھکنے لگا ——— اچانک ٹھنڈی اور تند ہوا چلنے لگی، درخت خوفناک انداز میں جھومنے اور چیخنے لگے، مصیبت زدہ لوگ ٹھنڈک اور خوف کے مارے ایک طرف دبک کر بیٹھنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ساری فضا اس گزر چکی قیامت کے تصور سے کانپ رہی ہے۔ شاہنی ابھی تک اپنے لڑکے کشور کے لئے رو رہی تھی اور رام لال اسے جھڑک رہا تھا۔

جب اچھی طرح دن نکل آیا تو لوگ اپنے اپنے ڈیرے کو لوٹے ایک خوف اور فسردگی ہر طرف چھا رہی تھی۔ تاجور سامری کوی پرکاش رام لُبھایا اور رام لال مختلف سمتوں کو کشور کو ڈھونڈنے نکل گئے۔

تاجور سامری یگیہ شالہ کے پاس سے ہو کر مائی کی جھگی سے ملتے ہوئے گراؤنڈ کی طرف چلا، ساری رات اس میدان میں قتل غارت لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رہا تھا۔ لیکن اُسے وہاں جانے میں کامیابی نہ ہوئی ایک انار کے پیڑ کے پاس کھڑے بلوچی سپاہی نے ڈانٹ کر کہا،

اوجوان! اُودر نہ جانا! ——— تاجور سامری ڈھٹائی سے آگے بڑھنے لگا تو اس کی گردن پر ایک مضبوط تھپڑ پڑا۔ کھانا، اُدھر نہیں جانا ——— سالا کا پھر ——— کیا کام ہے اودھر ——— یہ کہہ کر اس بلوچ فوجی نے اسے گردن سے پکڑ کر ایک طرف کر دیا۔ تاجور سامری کے ڈھیلے اس کش مکش میں آنکھوں سے تقریباً باہر آچکے تھے۔ گلا چھوٹا تو بولا۔ ادھر میرا ڈیرا ہے ———

بلوچی سپاہی نے آنکھوں سے زہریلے تیر برساتے ہوئے کہا۔ رات کو کہاں تھا؟ اب آیا ڈیرہ ڈھونڈنے ——— بھاگ جا یہ کہہ اس نے سنگین لگی رائفل اسکی طرف تان دی تاجور سامری اب عارضی ہسپتال کی طرف بھاگ آیا۔ اور ایک اونچے تخت پر کھڑے ہو کر اس نے سامنے نظر دوڑائی ——— سارے میدان میں گویا ہل چل سی پیدا ہو گئی کل تک یہاں اتنی چہل پہل تھی کہ گزرنا مشکل تھا۔ لیکن آج وہ ہزاروں آدمیوں کا بسیرا اجڑا ہوا تھا۔ گراؤنڈ کے کنارے پر بیشمار ٹرنک سوٹ کیس اور کنستر ٹوٹے پھوٹے پڑے تھے۔ تاجور سامری کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور وہ وہاں سے چل دیا۔ سڑک کی طرف کا حصہ بھی نچے ہوئے گلشن کا سماں پیش کرتا تھا۔ وہ رنگ برنگے اونچے نیچے شامیانے تنبو کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ ہر طرف سہمے سہمے اور مایوس عورت مرد بچے دبکے بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ ہسپتال میں رات کے زخمیوں کی مرہم پٹی ہو رہی تھی۔ باہر بہت بھیڑ تھی۔ وہ وہاں سے چلتا ہوا سکول کے ہال کمرے سے ملے ہوئے ہیڈ ماسٹر کے کمرے کے قریب پہنچا۔ یہاں بہت سے لوگ جمع تھے وہ بھی معلوم کرنے کے لئے ان میں گھسا اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک گنڈا سا سنگی باہر نکلا اور اس نے بھیڑ کو ڈنڈوں سے بھگانا شروع کیا۔ تاجور سامری اس کش مکش میں اندر گھس گیا۔ وہ سنگی اپنا کام ختم کر کے لوٹا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس کمرے میں سنگھ کے سرکردہ کرمچاری جمع تھے۔ سب فرش پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھے تھے۔ اور ان کے درمیان کچھ زیور رلیمی کپڑے روپیہ اور چاندی کے برتن پڑے تھے۔ تاجور سامری کے دیکھتے

ہی دیکھتے اس مال کے حصے بخرے کر لئے گئے۔ کیمپ کے انچارج بابو گیان چند نے ایک بڑے حصے پر قبضہ کیا۔ سب اس سے غیر مطمئن تھے لیکن ان کی تیز اور زہریلی نظروں کے سامنے کسی کو سر اٹھانے کی مجال نہ ہوئی ——— تاجور سامری حیرت سی کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ کہ اچانک اسکے کندھوں پر ایک بھاری ہاتھ پڑا اس نے چونکر پلٹ کر دیکھا تو اس گنڈے کو پایا جس نے باہر بھیڑ پر ڈنڈے برسائے تھے۔ وہ سنگی بولا، تم یہاں کیا کر رہے تھے۔ تاجور سامری نے مضبوطی اور استقلال کے انداز میں کہا۔ میرا ایک ساتھی نند کشور رات پہرے سے نہیں لوٹا۔ اس کی ماں بے حال ہو رہی ہے ..... بات ختم ہونے سے پہلے ہی اس گنڈے سنگھی نے تاجور سامری کو کمرے سے باہر نکالدیا۔

باہر بھیڑ پھر جمع ہو رہی تھی۔ ایک شخص نے ڈرتے ڈرتے تاجور سامری سے پوچھا، آٹے کی پرچیاں کب ملنی شروع ہونگی؟ ایک اور شخص بولا۔ میری لڑکی گم ہو گئی ہے۔ اس کا پتا مل جائیگا یہاں، اور ایک بوڑھا آگے بڑھا۔ اور چلا کر بولا، بابو صاحب میرا زیور سنگھ کے بڑے بابو کے پاس ہے! آج صبح جب وہ سب کی تلاشی لے رہے تھے تو مجھ سے یہ کہ کر لیلیا تھا کہ تمہیں واپس ملجائیگا۔ وہ کب ملیگا واپس ——— بوڑھے کی آنکھوں میں مایوسی کے آنسو تھے۔ تاجور سامری ایک گہرے دکھ کے بوجھ تلے دبا کسی کی بات کا جواب دیئے بغیر باہر دروازے کی طرف چلا آیا۔ اتنے میں ایک بھیڑ اندر داخل ہوئی۔ انمیں کچھ پولیس اور فوج کے سپاہی بھی تھے۔ ایک گورے رنگ کا بھرے بھرے جسم کا آدمی خاکی پینٹ پہنے ننگے سر۔ اُن سب کے آگے تھا۔ اسکے ساتھ آغا نجیب اللہ خاں سپرنٹنڈنٹ پولیس ملک غلام حیدر شہر کوتوال ——— اور شیخ بشیر احمد مالک چیف بوٹ ہاؤس اور شہری مسلم لیگ کے صدر۔ چودھری محمد صدیق پن مرچنٹ اور بہت سی جانی پہچانی مسلمان صورتیں نظر آ رہی تھیں۔ لوگ اس طرف امڈ آئے تھے۔ اور تاجور سامری سوچ رہا تھا کہ آخر یہ کون شخص ہے۔ آخر اُسے یاد آیا۔ سولہ اگست کی صبح کو گھنٹہ گھر کے چبوترے پر یقیناً

سیٹ پر ہو بیٹھے۔ ان کو پاس بیٹھے دیکھ کر وہ دونوں بھی ادھر متوجہ ہوئے رسمی تعارف ہوا۔ مولوی صاحب نے جب اپنے مخالفوں کی تعداد بڑھتی پائی تو وہ آنکھیں موند کر تسبیح کو گھماتے ہوئے کچھ بڑبڑانے لگے۔ تاجور سامری نے بات چھیڑتے ہوئے کہا آپ مولانا سے بحث کر رہے تھے۔ ان کا تو ہمیں احترام کرنا چاہیئے۔

خان صاحب اس کے مقصد کو پاکر طنز کو ذرا واضح کرتے ہوئے بولے جی ہاں جبھی تو استاد نے فرمایا ہی "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو"، لیکن صاحب ایسا تو جب ہو سکتا ہی کہ ہمارے پھٹے میں کوئی پاؤں تو نہ اڑائے۔ اور جب یہ حال ہو کہ ہمارا جینا دوبھر ہونے لگے ان کی کرم فرمائیوں سے، تو آپ ہی کہئے کوئی کب تک طرح دیگا۔ صاحب! مذہب کے متعلق تو میرا نظریہ صاف ہی کہ یہ انسانوں میں تفریق پیدا کرنے کا فرض زیادہ سرانجام دیتا ہی۔ تہذیب، اخلاق اور امن کی حفاظت کا کم۔ مثال آپ کے سامنے ہے ہندوستان جیسا عظیم ملک کروڑوں کی طاقت والا آج مٹھی بھر انگریزوں کے چنگل میں ڈیڑھ سو سال سے پڑا ہے اور مذہب ہی کی بدولت یہ مکار تاجر ہمیں تگنی کا ناچ نچائے چلا جاتا ہی ایک خون ایک گوشت پوست کے بنے ہندو مسلمان ایک دوسرے کے دشمن بنے بیٹھے ہیں۔ نواکھالی، بہار، اور پوٹھوہار میں آگ اور خون کا کھیل کھیلا جا رہا ہی۔ یہ سب کس کی مہربانی سے؟ میں کہوں گا مذہب کی مہربانی سے۔ مولوی صاحب؟

مولوی صاحب اب تک ضبط کئے بیٹھے تھے۔ لیکن یہ کہ کر۔ خدا تمہیں ہدایت دے۔ کھڑکی سے باہر سر نکال کر ٹھنڈی ہوا سے اپنی تمتمائی ہوئی پیشانی کو ٹھنڈا کرنے لگے۔ شیخ جی نے جھلا کر کہا۔ خدا تو اب کیا راہ دکھائیگا ہمیں۔ ہم تو چاہتے ہیں اگر یہی خونی تماشے کی طرف جاتا ہوا راستہ ہمیں دیکھنا ہی تو اس سے پہلے ہماری آنکھیں پھوٹ جائیں۔

یہ وہی ہی۔ یہ ڈپٹی کمشنر آغا عبدالحمید خاں کے سوا اور کون ہو سکتا ہی۔ وہ اسوقت خاموش اور مغموم ادھر ادھر دیکھتے دھیرے دھیرے چلے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے بیشمار لوگ اب سنگھ کے کرپچاری بھی ان سی آملے تھے۔ تاجور سامری بہی ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ واردات والے میدان کے پاس اُسی تخت پر وہ چڑھ چاروں طرف دیکھنے لگے جہاں سے تھوڑی دیر پہلے تاجور سامری نے اس میدان کو دیکھا تھا۔ لوگ اُمڈے چلے آتے تھے۔ اور خاموشی سے ڈپٹی کمشنر صاحب کی طرف دیکھ رہے تھے سب کی نظروں سی مظلومیت اور فریاد اور مایوسی کے آثار نظر آرہے تھے۔ اب ڈپٹی کمشنر صاحب نے بولنا شروع کیا۔

"دوستو! رات کو جو کچھ آپ پر بیتی ہی۔ میں اسکے لئے شرمندہ بہی ہوں اور دکھی بھی، مجھے مجبوریوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہی، نئے حالات اور نئے انتظامات نت نئی الجھنیں کھڑی کر رہے ہیں لیکن میں ان سب مجبوریوں سی لڑونگا۔ یہ واردات میری غیرحاضری میں ہوئی۔ اگر میں یہاں ہوتا تو آپ کو ان حالات سے دوچار نہ ہونے دیتا۔ میں جانتا ہوں قصور کس کا ہی اور سزا کس کو ملنی چاہیئے۔ مجھے اسوقت آپکے زخموں پر پھاہا رکھنا ہی۔ اور تکلیفوں کا انسداد کرنا ہی۔ اور وہ جبھی ممکن ہی اگر آپ بھی میرا ہاتھ بٹائیں۔ سب سے پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ آج سے فوج کا انتظام ختم۔ میں خود آپ کی خبرگیری کروں گا۔ میری پولیس آپ کی حفاظت کرے گی۔ اور آپکو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں اس ندامت کے بارسے سر نہیں اٹھا سکتا کہ پاکستان کی آزادی کی صبح آپ بے گناہوں کے خون سے رنگی طلوع ہوئی۔

اب آپ مجھے اپنا دکھڑا! اگر سنا سکتے ہیں تو سنایئے! کوئی خوف کی بات نہیں!۔

یہ کہہ کر آغا صاحب ایک طرف کرسی پر بیٹھ گئے ——— ایک بوڑھا بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور ہاتھ جوڑ کر دھاڑیں مارنے لگا۔ آغا صاحب نے ہمدردی اور دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ میرے بزرگ رونے کی جگہ آپ ضبط سے کام لے کر اپنی شکایت کہیں۔

وہ بڈھا بولا۔غریب نواز! میں لُٹ گیا ——— میری جوان لڑکی کو فوجی جمعدار مجھ سے چھین لے گیا۔میرا روپیہ اور زیور لوٹ لیا گیا۔حضور میں لُٹ گیا۔

آغا صاحب کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اور وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے بولے۔

تم حوصلہ رکھو بابا! میں تمہاری مدد کرونگا۔یہاں بیٹھ جاؤ۔تمہاری لڑکی اور تمہارا روپیہ تمہیں مل جائیگا ——— یہ سنکر بوڑھا ایک طرف چپکا بیٹھ گیا۔ایک شخص ایک لوتھڑا خون بھرے کپڑے میں لپٹا ہوا لایا۔ اور کہنے لگا حضور! یہ ایک نامکمل بچے کی لاش ہی۔حملہ آوروں نے اسکو وقت سے پہلے اسکی ماں کا پیٹ چاک کرکے دھرتی پر پھینکدیا۔وہ میری لڑکی تھی حضور! اس شخص سے آگے بولا نہ گیا۔اسکی آنکھیں خشک اور چہرہ ستا ہوا تھا معلوم ہوتا تھا وہ رو نہیں سکتا۔مگر جگر پانی ہو چکا ہی ——— اور محض ایک چلتی لاش رہگیا ہی۔

آغا صاحب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، آغا نجیب اللہ اور شیخ بشیر احمد بھی آنکھوں پر رومال رکھے ہوئے تھے۔

ایک جوان شخص جو وضع قطع سے مسلمان نظر آتا تھا۔آگے بڑھا۔مجمع میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، ارے یہ مسلمان۔......؟

وہ شخص کہنے لگا۔میں مسلمان نہیں ہوں غریب پرور۔مگر رات کو میری یہ وضع میری جان بچا گئی۔اگرچہ میں نے یہ کوئی بھیس نہیں بھرا۔یہ میرا عام لباس اور روز کی زندگی کا حصہ تھا۔مگر رات مجھے حملہ آوروں نے اپنا ساتھی سمجھ لیا۔میں نے بڑی کوشش سی لوگوں کی جانیں بچائیں۔ کیا عرض کروں وہ سماں کتنا بھیانک اور دوزخی تھا۔فوج والے حکم دیتے لیٹ جاؤ، ورنہ گولی ماردیجائیگی۔اور لیٹے ہوئے لوگوں کو حملہ آوروں کے برچھے اور چھرے ختم کردیتے۔فوجی روشنی کو پھینک پھینک کر جوان لڑکیوں اور مال والوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ رہے تھے۔اور آخر پچھلی رات اس ساری قتل گاہ کے نتیجے کو فوجی ٹرکوں میں بھر بھر کر دُور دریا اور نہروں میں پھینکا گیا۔میرے حضور میں نے اپنے ہاتھوں بہت سی نامکمل لاشیں ٹرکوں میں بھری تھیں۔میرا دل بھر کا

ہوگیا ہے۔ یں رو نہیں سکتا۔ غریب پرور جس کے سامنے ایسی قیامت گزری ہو وہ روکیونکر سکتا ہی۔
یہ کہہ کر وہ بیٹھ گیا۔ آغا صاحب غم اور غصے میں خاموش بیٹھے تھے۔ ایک شخص اٹھ کر بولا۔ میرے صاحب! جو چیز باہر والے لوٹ کرلے گئے تھے۔ وہ خیرات یہاں کے انتظام کرنے والے ہمارے محافظ ہمارے ہندو بھائی ہی ہیں لوٹتے رہے۔ میری لڑکی کے زیورات والے مجھ ہی تلاشی کے بہانے ڈیڑھ ہزار کے نوٹ چھین لئے۔ ایک بوڑھا رو کر کہنے لگا۔ حضور میں بھی اپنوں ہی کے ہاتھوں لٹا بیٹھا ہوں۔ میں ابھی ادھر سے پٹ کر آرہا ہوں۔ میں اپنا روپیہ ان سے مانگتا تھا۔ انہوں نے مجھے کمرے میں نیچا کر مارا ہی۔ صاحب میری مدد کیجئے۔

ایک عورت کہنے لگی۔ حضور! ان پر بندھکوں نے میرے خاندان کا راشن روک رکھا ہی۔ باہر سے ہم خرید نہیں سکتے۔ اگر فریاد کرتے ہیں تو بے عزتی اور مار سہنی پڑتی ہی ہمیں ان راکھشسوں سی بچایئے۔

اسپر ایک شور مچ گیا۔ اور مجمع سے آوازیں آنے لگیں حضور سب کے ساتھ ایسا ہی ہورہا ہی۔ کسی کو آٹا ملتا ہی کسی کو نہیں ملتا۔

صاحب بہادر اٹھے ان کا چہرہ غصے سے سُرخ ہوگیا۔ وہ بولے۔ اب میں ان لوگوں کو کیا کہوں، انکو شرم آنی چاہیئے۔ اگر باڑ ہی کھیت کو کھانے لگے۔ تو چورونکا گلہ کیسا۔ بھائیو! اب خاطر رکھو میں سب کچھ ٹھیک کردونگا مجھے حیرانی ہی کہ جب سب کا راشن تین چھٹانک فی آدمی بھجوایا جاتا ہے تو سب کو کیوں نہیں ملتا۔

ایک شخص بولا۔ حضور ہمیں تو روز کا ایک چھٹانک فی آدمی ملتا ہی۔ زیادہ کے لئے پیسے دینے پڑتے ہیں۔ لکڑی کے پیسے الگ۔

آغا صاحب آپے سے باہر ہو کر تخت سے کود کر نیچے آئے۔ سنگھ والوں میں الگ کھچڑی پک رہی تھی سب کے چہرے اُترے ہوئے تھے ــــــــ صاحب بہادر کہہ رہے تھے۔ یہ انتظام کی ذمہ داری میری تھی اور میں نے آپ پر بھروسہ کر کے یہ کام آپ کے سپرد

کیا تھا۔ اسپر غداری ہرگز معاف نہیں کرونگا۔ بابو صاحب! اب میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی بیچ میں ساری بھیڑ میں ہلچل مچگئی۔ سنگھ والے بابو گیا نند کے ساتھ صاحب بہادر کو گھیرے میں لئے ایک طرف کو نکل گئے۔ اور تاجور سامری اپنے ڈیرے کو لوٹا ——— جب وہ ڈیرے میں پہنچا تو وہاں کی فضا میں ایک خوشگوار سرگرمی نظر آئی۔ شاہنی پرات میں شکر ڈالے بانٹ رہی تھی۔ اور آس پاس سے اسے بدھائیاں مل رہی تھیں۔ اس کا بڑا لڑکا نند کشور رات بھر غائب رہا۔ امن ہونے پر آپ آگیا۔ رام لال اور رام لبھایا مٹھیاں بھر بھر کر شکر بانٹ رہے تھے۔ اور تاجور سامری کی ماں اور پرکاش نند کشور سے رات کی گمشدگی کے متعلق پوچھ تاچھ کر رہے تھے۔ تاجور سامری نے بڑھکر شاہنی کو بدھائی دی اور پرات پر جھپٹا مار کر ساری باقی ماندہ شکر ہتھیا کر دور جا کر کھانے لگا۔ اسپر قہقہے لگنے لگے۔ کرپارام لاغر اپنے پرانے دوست برہمچاری مہاتما کی کٹی میں بیٹھا دم لگا رہا تھا وہاں اسوقت خاصی چہل پہل تھی۔ برہمچاری جی چپکے آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔

دن بھر امید و بیم میں گزر گیا۔ دوپہر کے بعد ——— کے متعلق پروگرام بننے لگا۔ اتنے میں دوارکا بھون والی بہن جی کی لڑکی ہرشی اُداس سی چپکی آکر بیٹھ گئی۔ شاہنی نے پوچھا تو کیسی ہے ——— ماں کا کیا حال ہے ——— تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور کہنے لگی ماں تو رات ہی سے گم ہے۔ نہ جانے مار دی گئی کہ کوئی پکڑ لیگیا۔ میں اب بے بس اور بے سہارا پھر رہی ہوں۔ تاجور سامری کی ماں نے فوراً بڑھ کر اسے دلاسا دیا اور اپنے ساتھ رہنے کی دعوت دی ——— ہرشی رضامند ہو گئی ——— شاہنی نے پوچھا۔ جونا بھگت نے کوئی مدد نہیں کی؟ ہرشی پہلے تو چپکی رہی پھر بولی۔ اسی کا تو سارا کیا دھرا ہے، یہ سب! وہ مجھے یہاں سے نکل بھاگنے کو کہتا تھا..... سنگھ والے بھی اسی کے ساتھی جان پڑتے تھے۔ ناچار میں ادھر آگئی۔

تاجور سامری کی ماں نے غصے سے کہا۔ وہ موا ہی ہی بدمعاش آئے تو ادھر! منہ میں آگ

نہ لگادوں! تم یہیں رہو۔ بیٹی۔ ہم سب تیری مدد کریں گی ——— ہریش کہنے لگی۔ اس موئے نے ہمارا سامان بھی گم کر لیا ہی۔

شاہنی کہنے لگی۔ چلو تھو کو سامان کو۔ جان تو بچی ——— میرا دل کہتا ہی تیری ماں ری نہیں کوئی ہنکا لیگیا ہی۔ آجائے گی۔

تاجور سامری کی ماں نے پٹاری سے روٹی نکالکر پروس دی۔ اور ہریش کھانے لگی۔

تاجور سامری ایک طرف بیٹھ کر لکھنے پڑھنے میں لگ گیا۔

بلوچ فوجیوں افسروں اور سپاہیوں نے کیمپ میں بے ہتھیار گھوم کر اپنی بیگناہی ثابت کرنیکی کوشش کی اور آیندہ حفاظت کا یقین بھی دلایا لیکن ڈپٹی کمشنر صاحب کسیطرح بھی ان کو بحال کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ اور اسی دن کیمپ کے باہر عدالت لگائی۔ فوجی افسر اور سپاہی بطور ملزم پیش ہوئے۔ ایک مسلمان مصیبت زدہ نے گواہی دیتے ہوئے کہا،

"حضور ہم مشرقی پنجاب سے دکھ اٹھا کر اور گھر بار لٹا کر آئے تھے۔ ہمارے دماغوں کا متزلزل اور مشتعل ہونا لازمی تھا۔ سدھائے ہوئے فوجی افسروں نے ہمیں بہکا کر کیمپ پر حملہ کے لئے تیار کیا۔ بہت سے اِس اقدام سے انکار کرتے تھے۔ میں خود انکاری تھا۔ میں ان بیگناہ ہو پر ظلم نہیں ڈھانا چاہتا تھا۔ جو پہلے ہماری طرح بے گھر اور بے بس ہیں مگر فوجی صوبہ دار نے ہمیں برین گن سے اڑانے کی دھمکی دی۔ اور ساتھ ہی کہا کہ یہ قائداعظم کا فرمان ہی۔ کہ کافروں کو پاکستان کی دولت ہندوستان نہ لے جانے دی جائے۔

ایک اور بوڑھا پناہگزیں بھیڑ کو چیرتا ہوا سامنے آیا۔ اس نے لرزتے ہوئے کہا۔

"حضور مجھے ہندوؤں سے کوئی دشمنی نہیں۔ میں اور میرا جوان بیٹا ہمیشہ سے ہندو اور مسلمانوں کو ایک انسان کی طرح دیکھتے تھے۔ اس جبراً ترکِ وطن سے بھی ہمارے عقیدے

میں فرق نہ آیا۔ چنانچہ جب جو پہ دار صاحب کا حکم میرے بیٹے نے نہ مانا تو اسے گولی مار دی گئی۔ حضور میں اپنی پناہ گاہ میں مارا گیا۔ میں مسلمانوں کے ملک میں آکر مسلمانوں کے محافظوں کے ہاتھوں تباہ ہو گیا ہوں۔

صاحب بہادر روتے ہوئے بولے۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ مہربان بزرگ آپ کا بیٹا تو اب نہ واپس آنے سے رہا۔ مگر آپ کے مجرم کو سزا دیئے بغیر نہ رہونگا۔ آپ خاطر جمع رکھیئے۔ یہ حکم سنایا کہ بلوچ ملٹری کو بے ہتھیار کر کے ان کی تلاشی لی جائے۔ لوٹ کا مال کیمپ میں اس کے وارثوں میں تقسیم کیا جائے اور آج سے میری پولیس یہاں محافظ ہو گی! اس کے بعد عدالت برخاست ہوئی سارے کیمپ میں اس واقعہ سے متاثر ہو کر ڈپٹی کمشنر صاحب کی تعریف ہوتی رہی۔ عورتیں اُنہے دعائیں دیتی رہیں۔ کیمپ میں اب ایک اطمینان کی لہر دوڑ رہی تھی۔ لوگ اب بےخطر۔ کیمپ سے باہر نکل کر گھوم رہے تھے۔

شہر سے مسلمان اناج۔ گھی۔ کھانڈ۔ ترکاریاں اور پھل۔ دودھ لے آتے صاحب کا حکم تھا کہ مہنگے بھاؤ کوئی چیز نہ بیچی جائے لیکن سنگی محافظوں نے یہاں بھی اپنے ڈانڈے کی ایک صورت نکال لی۔ وہ مسلمان دوکاندار سیدھے گاہک کے ہاتھ سودا نہیں بیچ سکتے تھے۔ انکو ان ہندوؤں کے ہاتھ ہر چیز بیچ دینی پڑتی تھی جن کے پاس کیمپ انچارج کا دستخطی اجازت نامہ ہوتا۔ اور یہ اجازت نامہ ایک معقول رقم کے عوض میں چور بازار سے حاصل ہوتا تھا۔ راز کھولنے والے کے لئے جوتوں کی سزا تھی۔ ظاہر ہے مہنگے داموں خریدی چیز سستی تھوڑی بکے گی۔ چنانچہ جو چیز باہر روپے سیر ملتی وہ کیمپ میں چھے روپے سیر بکتی۔ شہر سے مسلمان نائی آکے باہر دکان لگا کر بیٹھے رہتے۔ لیکن کسی کو ان سے حجامت بنوانے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ وہ اجازت نامہ حاصل نہیں کر سکتے تھے اور چھ آنہ بال کاٹنے کے اور دو آنے ڈاڑھی کی اجرت اعلانیہ لیتے تھے۔ منتظموں نے اپنے چند نائی تیار کئے جو کیمپ میں سوا روپیہ بال کٹائی اور بارہ آنہ ڈاڑھی کے وصول کرتے۔ تاجو رسامری ایکدن اپنی جیب کی کمزوری سے مجبور ہو کر ایک مسلمان نائی سے حجامت بنوا آیا۔ اس پر وہ ہلڑ مچا۔ سنگھی محافظوں نے وہ

اچھل کود مچائی کہ توبہ ہی بھلی مگر تاجو سامری اپنی دھن میں مست رہا۔ وہ ہر چیز اب باہر سے سستے داموں خرید لاتا۔ اس سی سنگھ والے اسکے اعلانیہ دشمن ہوگئے۔ اس کے ڈیرے کی ہر ضرورت پر بات میں رخنہ ڈالنے لگے۔ مگر سب متحد تھے۔ اس لئے کوئی خرابی واقع نہ ہو سکی۔

لوگوں میں ایک جگہ پڑے رہنے کے کارن کاہلی اور سستی آگئی تھی۔ جھنگ شاہ کوٹ اور سرگودھا ضلع کے لوگ یوں بھی عموماً ڈھیٹ جھگڑالو اور سست ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ حاجت رفع کرنے کے لئے کیمپ کے نزدیک ہی بھدے بیٹھ جاتے اور کسی طرح اپنی ہٹ سے باز نہ آتے پولیس کے سپاہی انہیں بیدردی سے رائفلوں کے کندوں سے پیٹتے" مگر وہ ایسی مٹی کے بنے تھے کہ وہی کرتے جو کل کیا تھا۔ عورتیں مردوں سے بھی زیادہ ڈھیٹ پولیس والوں سے پٹتیں اور اپنے لوگوں سے جھگڑتیں۔ گالیاں بکتیں۔ اس کارن ہیضہ پھوٹ نکلا۔ روز درمیانی روش سی جواب جرنیلی سڑک کا کام دیتی تھی۔ ارتھیاں قطار در قطار جاتی نظر آنے لگیں۔ لکڑی کی کمی بلکہ قحط کے کارن مردہ جلانا تو ناممکن تھا۔ اس لئے دبائے جانے لگے اور وہ بھی کمزور ہاتھوں سے قبر بھی گہری نہ کھدتی۔ بلکہ بعض تو ہموار زمین پر لاش پر رکھ کر مٹی ڈال آتے۔ اور فوراً بعد ہی گدھ اور کتے لاش نکال کر بھنبھوڑنا اور کھانا شروع کر دیتے۔ لڑائی جھگڑا الگ دنگا فساد اس پر مستزاد ——— سنگھی محافظوں کی انتقامی سزاؤں سے بھی اس میں کچھ اضافہ ہی ہوتا۔ ایک دن ڈپٹی کمشنر صاحب نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ تھوڑے ہی دنوں میں یہاں سی ایک سکھوں کا قافلہ ہندوستان جانیوالا ہے۔ ہندو ملٹری کی نگرانی میں۔ میری رائے میں تم لوگوں کو اسمیں شامل ہو کر اس مصیبت سے چھٹکارا پا لینا چاہیئے۔ راستے میں سوائے سفر کی معمولی تکلیفوں کے اور کچھ کوئی ڈر کی بات نہیں ——— اسیر لوگ رضامند ہوگئے۔ اور سفر کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ چھکڑے، ٹھیلے، ریڑھیاں، بیل، گدھے اور بھینسے خرید و فروخت کے لئے کیمپ کے باہر آنے لگے۔ یہاں بھی خوب بلیک مارکیٹ سرگرم رہی۔ تاجو سامری کے

ڈیرے والوں نے بھی مشترکہ طور پر شہر کے ایک پرانے واقف جھبیور ٹھیلے کا معاملہ کر لیا۔ دو سو روپے طے ہوئے اس نے ایمانداری سے ہندوستان سامان پہنچانے کا یقین دلایا۔ تاجور سامری کی ماں نے ضمانت دی کہ اس جھبیور کی بیوی میری پرانی سہیلی ہے ان سے معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں چنانچہ سب کچھ طے ہو گیا اور سب سامان کو مختصر اور دوسری تیاریوں میں لگ گئے۔ کیمپ میں اب ایک نئی سرگرمی نظر آنے لگی۔ کہیں پرانے چھکڑے کی مرمت جاری ہے تو کہیں ایک بڑے صندوق میں موٹر کے پہیئے لگا کر اسے ٹھیلہ بنایا جا رہا ہے۔ کہیں پرانی موٹر ہی کو بیل جوتنے کے قابل بنایا جانے لگا۔

تاجور سامری ہر روز کیمپ میں گھومنے لگا۔ اگرچہ وہ بیمار تھا لیکن اس سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا تھا۔ ہر روز وہ کوئی نہ کوئی نئی بات دیکھتا۔ ایک جگہ اس نے دیکھا ایک نائی جسے پہلے کبھی حکمت یا طب سے سابقہ نہیں رہا۔ اب وید بنا بیٹھا تھا۔ وہ اعلانیہ کہہ رہا تھا ایک مشہور حکیم کی بیاض سے ہیضہ کا نسخہ حاصل کیا ہے۔ بھولے اور دکھی لوگ اس کی نام نہاد دوا کو خرید کر اپنے پیسے ضائع کر رہے تھے۔ تاجور سامری کو پاس کھڑے دیکھ کر اس نے آنکھ کے اشارے سے بلایا اور کان میں کہا۔ تم بھی ڈاکٹر بنے پھرتے دوارکا بھون میں ایک پائی نہ کما سکے! دیکھ لو۔ یار لوگوں نے پانی میں پھٹکری گھول کر سو روپیہ جمع کر لیا ہے۔ آؤ کر لو ساجھا! بڑے فائدے کا کام ہے —— تم صرف میرے نائب بن جاؤ۔ تاجور سامری کچھ جواب دیے بغیر آگے نکل گیا۔

ایک شام کو سب لوگ کھانا وغیرہ کھا کر سونے کی تیاریوں میں تھے۔ جیونا بھگت چند سنگھی رضا کاروں کے ساتھ آ دھمکے اور آتے ہی بولے۔ ہریش اٹھ چل میرے ساتھ! ہریش چپکی ہو رہی —— جیونا بھگت پھنکار کر بولے۔ دیکھا پرکاش جی! انہوں نے لڑکی کو کیسا سکھا پڑھا رکھا ہے۔ بات کا جواب ہی نہیں دیتی حالانکہ میری سگی بھانجی ہے۔ پرکاش جی نے اپنی لاٹھی کو ذرا اونچا کر کے بولا۔ اٹھتی کیوں نہیں ہو ہریش۔ چلو ہمارے ساتھ۔

ہریش غنغنائی —— میں نہیں جاؤں گی۔

نہیں جائے گی۔ پرکاش جی آنکھیں نکالتے ہوئے بولے۔

جیونا بھگت نے پھسلا کر کہا۔ اپنے ماموں کے ساتھ بھی نہیں جاؤ گی۔ ہرلش ہرلش اب اکڑ کر بیٹھ گئی اور گرج کر بولی۔ تم میرے کون ہوتے، بدمعاش مجھے بیچنا چاہتے ہو۔ جاؤ میں تمہاری کچھ نہیں ہوتی۔ ہمارا سارا سامان ہڑپ کر گئے، چور کہیں کے۔ اور یہ تمہارے بدمعاش ساتھی مجھے کہتے تھے بیاہ کر لو۔ میرے ساتھ ——— جاؤ میں نہیں جاؤں گی۔

اس جھاڑ سے وہ سنگھی تو فوراً کافور ہو گئے اور جیونا بھگت ہی کان ملتے ہوئے اسکے پیچھے دوڑے جیسے اسے کچھ کہنے جا رہے ہوں ——— پڑوس کے ایک سردار جی بولے۔ اب کی یہ سالے آئے تو میں ٹانگیں توڑ دونگا۔ بردہ فروش کہیں کے۔

تھوڑی دیر کے بعد جیونا بھگت پھر آئے۔ لیکن اب دوسرے بھروپ میں۔ آتے ہی تاجور ساحری سے کہنے لگے۔ مجھے تو تمہاری شرافت پر پہلے ہی بھروسا تھا مگر یہ لوگ نہیں مانتے تھے۔ اب میں نے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ کوئی ڈر کی بات نہیں۔ ہرلش آپ کے ساتھ رہے مجھے خوشی ہے۔

ہرلش کچھ کہنے کو اٹھی ہی تھی کہ شاہنی نے اسے روک دیا۔

جیونا بھگت نے پینترا بدلا۔ ہاں تو سنا ہے تم نے ٹھیلا کیا ہے۔ ہندوستان کے لئے میرا حصہ نہیں ڈالو گے ——— رام لال بولا۔ اب تو گنجائش نہیں۔

جیونا بھگت کہنے لگے، میرے لئے ضرور نکل آئیگی۔ میں خود اس سے ملتا ہوں میرا ایک اور ساتھی بھی ہے۔ کیا حرج ہے روپے کی کفایت رہیگی۔ اور پھر میں خود ساتھ رہونگا ٹھیلے کے۔

یہ کہہ وہ ایک طرف کو چل دیا ——— تاجور ساحری نے کہا۔ اسکو شامل نہیں کرنا چاہیے دھوکا دیگا۔ مجھے یہ شخص بڑا فریبی اور خود غرض نظر آتا ہے ——— کرپا رام لاغر کہنے لگے اجی چھوڑو میں سنبھال لونگا۔ ایسے ایسے بدمعاش تو میں نے پولیس کی ملازمت کے زمانے میں ہزاروں سیدھے کئے ہیں۔ تم فکر نہ کرو ——— رات بہت جاگنے کے سبب سب پڑ کر سو رہے۔ +

قافلہ چل پڑا

قافلے کی تیاریاں کئی دنوں سے ہو رہی تھیں ہر دوسرے دن کوچ کی تاریخ مقرر کی جاتی۔ لوگ زادِ سفر تیار کرتے سواریوں اور چھکڑوں کو درست کرتے۔ اکثر اس میدان میں جہاں قتل عام ہوا تھا۔ چھکڑوں بیل گاڑیوں اور ٹھیلوں کی پریڈ بھی ہوتی مگر ہر بار کوئی نہ کوئی وجہ ایسی نکل آتی جس سے کوچ پھر دوسرے دن پر ملتوی ہو جاتا۔ ایک شام کو اچانک لاؤڈ اسپیکرز کے ذریعے اعلان ہوا کہ آج رات کو قافلہ کوچ کر لیگا۔ جانیوالے راشن ڈپو سے اپنا سفری راشن حاصل کر لیں۔ کرپا رام لاغر۔ رام لال۔ اور رام لبھایا۔ راشن ڈپو کیطرف لپکے۔ تاجور سامری کی ماں شاہنی اور رام لبھایا کی بیوی راستے کے لئے روٹی اور پکوان تیار کرنے لگیں۔ تاجور سامری نے ایک تھیلے میں اپنے مسودے اور لکھنے پڑھنے کی ضرورت کے کاغذات رکھ لئے۔ پرکاش کو نمونیا ہو گیا تھا۔ اس تکلیف سے وہ کچھ چڑچڑا اور ضدی ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے گیتوں اور کوتا کے مسودے تاجور سامری سے لیکر ایک سوٹ کیس میں بھر لئے اس میں اور بھی بہت سی کام کی چیزیں تھیں۔ سامان بندھ چکا تھا۔ اسی بیچ میں وہ جھبورا اور اس کا ساتھی بھی آ گئے۔ انہوں نے تھیلے میں سامان بھرنا شروع کیا۔ اس نے بتایا کہ جیونا بھگت بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔ اس کا ہمیں بڑا فائدہ رہیگا۔ تاجور سامری نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر اس کی ماں نے اُسے اشارے سے خاموش کر دیا۔ کوی پرکاش کا نمونیہ اگرچہ ختم ہو چکا تھا مگر کمزوری بیحد تھی۔ تاجور سامری نے کہا میں تمہیں بیٹھ پر اٹھا کر لیچلونگا بیفکر رہو۔ اس نے ایک سائیکل بھی خریدی تھی جس پر رام لال کا رد کیا ہوا لحاف بندھا تھا۔

غضب خدا کا دنیا کٹی جا رہی ہے۔ انسانیت پر قیامت ٹوٹی پڑتی ہے۔ اور یہ حلوے مانڈے کے رسیا ابھی تک اپنی ہی الاپتے چلے جا رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر مذہب نے کچھ راہ دکھائی تھی۔ تو وہ یہ نہیں تھی جو ان جیسے بزرگ دیں ہمیں دکھا رہے ہیں۔ اگر کوئی تھی تو محبت اور اخوت کی راہ تھی۔ امن اور عافیت کی راہ تھی۔

خان صاحب نے کہا بیشک، میں تو کہتا ہوں، پاکستان اور ہندوستان کے جھگڑے میں صاف انگریز کا ہاتھ ہے۔ اور ہم ہیں کہ ہوش مندی کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور وحشیانہ طور پر ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کو بھی دوڑتے ہیں

سردار جی بولے آپ تو بہت اونچے خیال کے انسان ہیں۔ آپ کو تو ایسا ہی سوچنا چاہیئے تھا مجھ جیسا۔ اُجڈ بھی یہی سوچتا ہے۔ کہ ہم بھائیوں بھائیوں کے معاملہ میں مذہب کیوں ٹانگ اڑا رہا ہے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ انگریز کو ہماری بے اتفاقی ہی سے اس جگہ زیادہ دیر تک قابض رہنے کا موقع ملتا ہے۔ اگر آج ہم سب اختلاف اور بیر بھول جائیں تو انگریز ایک لمحہ یہاں نہ ٹھہر سکے۔

تاجور سامری بولا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لیجئے۔ کہ اب وہ ایسے حالات پیدا کر رہا ہے کہ ہم میں سے جا کر بھی ہم پر حکومت کرتا رہے گا۔ مذہبی بنا پر ہندوستان کی تقسیم ہو جانے پر آبادیوں کا تبادلہ ہوگا.....

شیخ صاحب بات کاٹ کر بولے، آپ بھی تقسیم کو مانتے ہیں؟

تاجور سامری نے کہا۔ میں تقسیم کا حامی نہیں۔ لیکن تقسیم ہوگی ضرور وہ میرے یا آپ کے نہ چاہنے کے باوجود ضرور ہوگی۔ کیوں؟ ہم جیسے لوگ کم گنتی میں ہیں۔ انگریز اور اس کے مُہروں کے تماشائیوں کی تعداد زیادہ ہے۔

پڑوس کے ایک کیمپ میں ایک جھیور خاندان رہتا تھا۔ ایک لڑاکا بڑھیا اور اس کی روز پٹنے والی مسکین سی بہو اُس کے چار لڑکے اور بوڑھا خاوند جو چارپائی پر پڑا پڑا بہو کو گالیاں دیتا رہتا۔ وہ لڑکا جس کی بیوی تھی اس شخص کا داہنا بازو نصف سے زیادہ کسی حادثے کی نذر ہو چکا تھا۔ اسلئے بیوی اس سے ناخوش جان پڑتی تھی۔ سب سے چھوٹا دیور کڑیل جوان تھا۔ اُسے پسند کرتی تھی مگر منجھلا بدصورت اور بدمعاش قسم کا نوجوان اسے اپنی طرف کھینچنا چاہتا تھا۔ اس کھینچا تانی کے کارن روز رونے پیٹنے اور گالیاں بکنے کی آوازیں اس کیمپ سے آتیں تاجور بیماری نے اس روز روز کی دانتا کِل کِل سے تنگ آکر انکی طرف توجہ دینی چھوڑ دی تھی۔ اب قافلے کے ساتھ جانیکی تیاریوں نے انکی کھٹ پٹ کو ایک خوشگوار سمجھوتے اور سرگرمی میں بدلدیا تھا۔ وہ ایک چھلے نما تانگے میں جس کے آگے ایک گرانڈیل خچر جُتا تھا۔ اپنا سامان لاد رہے تھے۔ بوڑھا چارپائی چھوڑ کر ایک ٹرنک پر نئے کپڑے پہنے بیٹھا ہوا کچھ کھا رہا تھا۔ بڑھیا چولہے کے آگے بیٹھی پکی ہوئی کوئی چیز کھانیوالوں میں تقسیم کر رہی تھی۔ اور بہو ایک طرف بیٹھی اپنی نئی شلوار کی بناوٹ پر خوش ہو رہی تھی۔

خاصا اندھیرا ہونے پر راشن ڈپو سے آٹا لیکر رام لال اور کرپا رام لاغر اور رام لبھایا آئے فی آدمی سیر آٹا ملا تھا۔ آٹے کی گٹھری ایک طرف رکھ کر سب کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ رام لال نے کہا، میرے خیال میں ہم پندرہ دن میں ہندوستان پہنچیں گے۔

"کیوں! بمبئی تو نہیں جانا ہے!" پجاری جی کہہ رہے تھے زیادہ سے زیادہ آٹھ دن لگیں گے۔ چاہے جدھر سے بھی جائیں"، کرپا رام لاغر نے کہا،

رام لبھایا بولا۔ میرا خیال ہے ہمارا یہ قافلہ قصور کے راستے جائیگا۔ اور اُس راستے میں آٹھ دن نہیں لگیں گے۔ کل ایک فوجی حوالدار سے مجھے پتا چلا تھا۔ جو کیمپ کے دفتر میں آیا تھا

شاہنی بولی۔ تو آٹھ دن رات ہم چلتے ہی رہیں گے۔

نہیں۔ زیادہ سے زیادہ تیرہ میل روز چلنا پڑے گا۔ کئی جگہ پڑاؤ ہوں گے۔

رام لبھایا نے جواب دیا۔

تاجور سامری کی ماں نے کہا۔ مگر سیر بھر فی آدمی آٹا تو بہت کم ہے آٹھ دنوں کے سفر کیلئے۔ کیا کریں گے! ہم؟

رام لبھایا نے جواب دیا۔ ہماری ہندو ملٹری ہمارے کھانے پینے کا سب انتظام کرے گی۔

رام لال۔ اچھا! پھر تو مزے سے ہندوستان پہنچ جائیں گے۔

شاہنی بولی۔ چلو ہندوستان تو پہنچ جائیں گے۔ اپنے وطن میں موت سے بچ جائیں گے۔ یہاں تو پل پل بھاری ہو رہا ہے۔

تاجور سامری ایک طرف بیٹھا آزاد ہندوستان کے سہانے تصور میں کھو گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ وہ لوگ کتنے خوش قسمت ہیں جو ہندوستان کی آزاد فضا میں وقت سے پہلے پہنچے ہیں وہ اب خیال کے پروں پر ہندوستان کے خوشگوار ماحول پر تیرنے لگا۔

اچانک تاجور سامری ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا باپ کہہ رہا تھا اٹھو قافلہ کوچ کر رہا ہے دیکھو سب تیار کھڑے ہیں۔ تاجور سامری نے دیکھا کہ ہر طرف ایک سرگرمی ایک ہل چل مچی ہے۔ لیمپوں اور گیسوں کی روشنی میں ٹھیلے اور بیل گاڑیاں قتل گاہ والے میدان سے ہو کر سڑک کی طرف جا رہی ہیں۔ کرپا رام لاغر نے تاجور سامری کا سائیکل سنبھالا۔ اور تاجور ساہنی نے اپنے بھائی کوی پرکاش کو پیٹھ پر اٹھایا اور ایک صاف سی راہ سے سڑک کی طرف چلا۔ سب ایک ساتھ چلے آئے۔ روشنی اور دھندلاہٹ نے نگاہوں میں ایک خیرگی پیدا کر دی تھی۔ مگر ایک سرخوشی اور سرگرمی کے عالم میں سب اچھلتے کودتے سڑک پر جا پہنچے وہاں پہلے ہی جاٹوں کے بڑے بڑے دیہاتی چھکڑوں کی قطار رواں تھی۔ کیمپ کے ٹھیلے اور بیل گاڑیاں ان کے پیچھے لگا دی گئیں۔ پیدل آگے نکلے جا رہے تھے۔ تاجور سامری کوی پرکاش کو پیٹھ پر لادے تیزی سے آگے نکل گیا۔ نند کشور اور رام لبھایا اس سے آملے باقی کے ساتھی پیچھے رہ گئے۔ سڑک کی بجلی کی روشنی میں لوگ بڑھے جا رہے تھے۔

سڑک کے دونوں طرف مسلح سپیشل پولیس ہر دس قدم کے فاصلے پر موجود تھی۔ لوگ بے کھٹکے چلے جا رہے تھے۔ اب تاجور سامری سرکاری اصطبل کے سامنے آگیا اُس نے دم لینے کے لئے گوپی پرکاش کو ایک طرف بٹھا دیا، اور ـــــ ایک حسرت بھری نظر اندھیرے میں دور تک ڈالی اس کا دل اب رونے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ سہانے دن فلمی تصویروں کی طرح ناچنے لگے۔ جب وہ اس اصطبل کے پاس کے کھیتوں اور چھبال کے آس پاس صبح و شام سیر کے لئے آیا کرتا تھا،   جب شہر کی شور بھری فضا سے اس کا جی اُوبتا تو اکثر راتوں کو بھی اپنا تانپورا لیکر آجاتا کبھی کوئی نیا خیال سوجھتا تو بھی اُسے لکھنے کی امنگ اس طرف کھینچ لاتی۔ یہ اس کھیت کے پار کا گھوڑ دوڑ کا میدان، اور اس کا دلفریب سبزہ زار یہاں وہ بیشتر آتا۔ راتیں کبھی چاندنی ہوتیں کبھی اندھیری، لیکن اسکے لئے ہر حالت میں یہ ماحول یہ خاموش فضا ایک حسن ایک سکون اُسے پیش کرتے، وہ خیالوں کی لہریں بہا جا رہا تھا کہ گوپی پرکاش کی خفیف آواز نے اسے چونکا دیا۔ میں تھک گیا ہوں۔ تاج! بیٹھے بیٹھے۔ تاجور سامری نے پھر اسے پیٹھ پر لادا اور چلنے والوں کے ساتھ ہولیا لوگ تیزی سے چلے جا رہے تھے جیسے کارنجی ہاؤس سے ہفتوں کے ڈھور یا کٹ گھر سے قیدی مرغ، مرغیاں ـــــــــ محافظ پولیس کے سپاہی بعض باتوں میں مشغول تھے، بعض بجلی کے کھمبوں سے ٹیک لگائے اونگھ رہے تھے۔ اب چناب کلب، جہاں اکثر انگریز افسر خوش فعلیاں کیا کرتے تھے ـــــ رات کے اندھیرے میں درختوں کے جھرمٹ میں جھلک رہا تھا۔ اب قافلہ اسٹیشن کی طرف جانے والی ٹھنڈی سڑک کو ہولیا گوپی پرکاش نے کہا ہیں اب چلنا چاہتا ہوں بھیّا! مجھے سہارا دیکر دھیرے دھیرے چلاؤ تاجور سامری نے اسے آہستہ سے پیٹھ سے اتارا اور بغل میں لیکر دھیرے دھیرے چلا لوگ تیزی سے جا رہے تھے۔ اچانک دو چمکتی ہوئی کاریں سرر سے پاس سے گزر گئیں اور تھوڑی دیر بعد پھر آئیں اور قافلے کے دہانے کی طرف چلی گئیں۔ رام لبھایا اور

نند کشور ذرا پیچھے رہ گئے تھے مگر اب پھر آملے تھے۔ رام بھایا نے بتایا کہ ان کاروں میں ڈپٹی کمشنر صاحب اور سپرنٹنڈنٹ پولیس اور دوسرے ہمارے خیر خواہ افسر بیٹھے دورہ کر رہے تھے بہت جلد یہ بات سارے قافلے میں پھیل گئی۔ اب لوگوں میں ایک بھروسے اور امنگ کی رو دوڑ گئی۔ نند کشور نے کہا۔ میں نے ایک سپاہی کو اپنی ایک ساتھی سے یہ کہتے سنا تھا کہ طارق آباد قافلہ چلنے سے دو دن پہلے پناہ گزینوں سے خالی کرا لیا ہے۔ اور کہ اب یہ قافلہ بالکل خیریت سے گزر جائیگا۔ یہ بات بھی پھیلتی پھیلتی ہر طرف پھیل گئی۔ اور لوگ ایک مسرت اور بے خوفی کے احساس سے چہک چہک کر چلنے لگے۔ تاجور سامری اور اس کے ساتھی سٹیشن سے گزر کر طارق آباد کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ اور سب کے دل خوف اور مایوسی کے بوجھ تلے دبنے لگے تھے۔ وسوسے اُٹھ رہے تھے۔ کہ کہیں دھوکا ہی نہ دیا جا رہا ہو لیکن جوں جوں نزدیک پہنچتے جا رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ طارق آباد سے روح زندگی سلب کی جا چکی تھی۔ چنانچہ سب بیخوفی اور امنگ سے طارق پار کر گئے۔ اب نہر کا پل آگیا تھا۔ یہاں رگھ رام بھایا تاجور سامری کوی پرکاش اور نند کشور اپنے پیچھے رہ گئے ساتھیوں کی راہ دیکھنے لگے۔ کوی پرکاش ہی غیر متوقع طور پر اب بے تکان اور خوش نظر آرہا تھا وہ ایک طرف پل کا سہارا لیکر بیٹھ گیا۔ لوگ گزرتے جا رہے تھے اور خالصہ کالج کیمپ کے رہنے والے سڑک پر ایک بھاری بھیڑ کی صورت میں دونوں طرف کھڑے ان جانیوالوں کو دیکھ رہے تھے بعض اپنے واقفوں اور دوستوں کو ہندوستان کے لئے سندیسے دے رہے تھے۔ اب کرپارام لاغر اور دوسرے لوگ بھی تاجور سامری سے آملے۔ تاجور سامری کی ماں دونوں بھائیوں کو صحیح سلامت اور خوش خوش دیکھ نہال ہو گئی اور پھر سب چلنے لگے اور اس بھیڑ سے گزرنے لگے۔ جو کالج کے دروازے پر کھڑی تھی۔ بجلی کی روشنی سے وہاں دن کا سا سماں تھا۔ اس مجمع میں کئی جانی پہچانی صورتیں نظر آرہی تھیں سب اس وقت خوش اور پُر امید نظر آرہے تھے

ایک موٹا سا گورے رنگ کا سکھ پکارا بشن سنگھ! وہ کرپا رام لاغر۔ قومی شاعر جا رہا ہے۔ ایلو وہ تاجور سامری بھی اُردو کا مشہور شاعر وہ بھی سلامت ہے۔ کوئی شخص بھیڑ سے پکارا، تاجور سامری صاحب! اس حالت کو دیکھتے جایئے اور ہندوستان جا کر چھپوایئے تاکہ لوگ اصلی حالات جان سکیں۔

تاجور سامری نے اونچے گلے سے جواب دیا۔ میں ضرور لکھوں گا بھائی؟ میں لکھا ضرور بھولے بھٹکے لوگوں کے ذہنوں کو سچائی کی روشنی دیگا۔ اور پھر وہ سوچنے لگا۔ کیا واقعی میں لکھ سکوں گا۔ جو کچھ ان آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا ہے۔ وہ کہا بھی جا سکے گا؟ کیا ایسا ممکن ہے ——— وہ منطقی خیالوں میں الجھا ہوا۔ بیخودی میں چلتا گیا۔ اب روشنی دور رہ گئی تھی۔ اور گھٹا ٹوپ اندھیرے والا راستہ آگیا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف سکھ جاٹوں کے سامان سے بھرے چھکڑے جن کے آگے بیل بندھے تھے اس کے پرے دوسرے پالتو مویشی اور زمین پر سوئے ہوئے تھکے ہوئے لوگ یہ چوہڑ ماجرا کا قافلہ تھا۔ جس کو کل یہاں سے کوچ کرنا تھا مگر آج یہ سکول کیمپ کے لئے رک گیا تھا۔ سب اندھیرے میں بچتے بچاتے چلے جا رہے تھے۔ ابھی قافلے کی محافظ ہندو فوج کا پتا نہ تھا مگر لوگ بے کھٹکے امیدوں کی روشنی کے سہارے بڑھے چلے گئے آزادی اور زندگی کی راہ پر اطمینان اور امن کی سرزمین کو۔ تاجور سامری اس کے ماں باپ اس کا بھائی کوی پرکاش۔ رام لبھایا۔ رام لال۔ شاہتی نند کشور۔ رام لبھایا کی بیوی ——— تاجور سامری کی بھانجی ——— اور رام لال کے بچے سبھی چلے جا رہے تھے۔ اندھیرا اور اوبڑ کھابڑ راستہ ہونے کے باوجود چلے جا رہے تھے ——— چلتے چلتے۔ اب دن نکل آیا۔ رات کے دو بجے چلے تھے پانچ چھ میل کا سفر طے ہو چکا تھا۔ سڑک کے کنارے کے دیہاتوں کے رہنے والے مسلمان (جانگلی) سڑکوں پر بڑے باندھے آنکھوں میں حسرت اور افسوس لئے چپ چاپ

کھڑے تھے۔ آخر ایک بوڑھا شخص جس کے سر اور بدن کے بال بھی سفید ہو چکے تھے۔ رو کر پکارا ——— او شہر والو، تم ہم کو کس کے سہارے چھوڑے جاتے ہو۔ تم نے اس بنجر زمین کو گلزار بنایا، تم ہماری ہر ضرورت اور ہر مصیبت کے ساتھی بنے۔ مگر آج تم پٹے جا رہے ہو، دوستو یہ ہم نہیں نکال رہے تم کو گورے حاکم نکال رہے ہیں۔ ہماری طرف سے دل میلا نہ کرنا بھائیو! ہم مجبور ہیں۔ ——— ایک جوان عورت بولی یہ اتنی لڑکیاں اور عورتیں غمگین صورتیں بنائے کہاں جا رہی ہیں۔ ہا یا! جیسے ان سبکو بہت ستایا گیا ہو۔

اس بوڑھے نے جواب دیا۔ بی بی۔ کچھ نہ پوچھو اپنر ظلم ہو رہا ہے۔ یہ اپنے گھروں سے جبراً نکالے جا رہے ہیں۔

تو پھر وہ شہر چھوڑ دیں۔ اور دیہاتوں میں آ بسیں۔

بوڑھا بولا۔ بھولی لڑکی۔ یہ اب راوی کے ادھر کہیں بھی نہیں بس سکتے۔ گورے عیار نے انہیں ایسا اکھاڑا ہے کہ یہاں اب ان کے قدم جمنے ناممکن ہیں۔

یہ سُنکر وہ جوان عورت رونے لگی۔

تاجور سامری اس دیہاتی بوڑھے کی یہ گہری بات سنکر حیران رہگیا اور آگے چل پڑا۔ اب گڑھوالی فوج کی لاریاں دندناتی ہوئی آنے جانے لگیں۔ اسپر بیٹھے گڑھوالی جوان پکار پکار کر قافلے والوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ چلو چلو بہادرو! تھکنا نہیں۔ چند دنوں کی بات ہی ہندوستان پہنچ جاؤ گے۔ تو سب مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔ کوئی فوجی پکارتا ——— بس آج زیادہ نہیں چلنا ہے۔ صرف چند میل پھر پڑاؤ ہوگا۔ رات کو سب کو چاول اور آٹا بیٹ بھر کھانے کو ملے گا چلو۔ چلو۔

یہ نعرے یہ سہانی پکاریں چلنے والوں میں زندگی اور امید کی روح پھونکر ہی تھیں

اور لوگ چلے جا رہے تھے ——— اس تیزی میں تاجور سامری کا والد کرپارام لاغر ان سے پیچھے رہ گیا۔ راستے کے کھانے کا سامان کا بقچہ اس کے پاس تھا ——— کوی پرکاش کی کمزوری حیرت ناک طور پر مٹ رہی تھی ایک امید ایک خوشی اس کے چہرے کی زردی کو سرخی میں بدل رہی تھی۔ اور وہ خوشدلی سے مناسب چال سے راستہ طے کر رہا تھا۔ قافلے کے شہری مسافر جو آریہ سکول کیمپ اور خالصہ کالج کیمپ سے شامل ہوئے تھے ڈیڑھ مہینے کی قید اور جان لیوا پابندی سے چھوٹے ہوئے خوشنما امیدوں اور روشن مستقبل کے خوشگوار خیالوں کے پروں پر گویا اڑتے چلے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے دوپہر ڈھل گئی سڑک کے دونوں کناروں پر کہیں کہیں فرلانگ بھر ہٹ کر کھڑے نزدیکی دیہاتوں والے مسلمان اس بیتیں میل لمبے قافلے کو دیکھ رہے تھے۔ کہیں مشرقی پنجاب کے مصیبت زدہ مسلمان بھی چٹیل میدانوں میں ڈیرے ڈالے دکھائی دیتے۔ دیکھنے والے سبھی ان جانیوالوں کو ہمدردی اور دکھ بھری آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

دن ڈھل چلا تھا اور پڑاؤ کی جگہ بنگلہ اواگت ابھی کئی میل دور تھی۔ کوی پرکاش تھک کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اور نحیف آواز میں کہنے لگا بھیا! اب میں ایک قدم نہیں چل سکتا۔ تاجور سامری گھبرا گیا۔ سوچنے لگا اب کیا ہو۔ کوئی شخص مدد کرنے کو تیار نہیں ——— سبھی اپنی اپنی دھن میں چلے جا رہے ہیں۔ کس سے کہا جائے۔ اچانک ایک گھوڑے سوار سردار جی سے اس نے منت سے کہا کہ میرا بھائی بیمار ہے پڑاؤ تک اس کی سواری کا انتظام کر دیجئے۔ سردار جی ——— ہمدردی سے کام لیتے ہوئے فوراً پیچھے کی طرف لپکے اور پھر لوٹ کر کہا۔ وہ ہمارا فوجی ٹرک آ رہا ہے وہ بیمار اور بوڑھے آدمیوں کو بٹھا لیتے ہیں۔ تمہارے بھائی کا میں وہیں انتظام کر دونگا۔ اتنے میں ٹرک آکر وہاں رک گیا۔ ایک فوجی نے کوی پرکاش کو نڈھال دیکھ کر کہا۔ تھک گئے ہو تو آجاؤ سردار جی کے کہنے کی ضرورت نہ رہی کوی پرکاش کو تاجور سامری نے سہارا

دیکر ٹرک میں بٹھادیا۔ اچانک آواز آئی۔ ماما۔ تاجور سامری نے دیکھا تو اپنی بھانجی لبھی کو پایا —— لبھی بولی۔ بی بی اور شاہنی پیچھے آرہی ہیں۔ ٹرک چل پڑا۔ اور تاجور سامری اب اطمینان سے اپنا راستہ طے کرنے لگا۔

جھٹپٹے کے وقت تاجور سامری واگت بنگلے پہنچ گیا۔ بنگلہ دو فرلانگ دور تھا اور پڑاؤ ادھر ہی ایک خالی میدان میں ہوا۔ پہنچے ہوئے لوگ اپنے ٹھکانے ڈیرے درست کر رہے تھے کہیں آگ سلگ رہی تھی۔ کہیں چولہا گرم تھا۔ ہر طرف ایک سرگرمی اور چہل پہل کا عالم تھا قافلہ ابھی چلا آرہا تھا۔ نہر کے پاس سے فوجی سفرمینا کی لاریاں پانی صاف کرکے کینوس کے حوض میں بھر رہی تھی۔ اس کے انجن کی آواز سارے جنگل کو گونجا رہی تھی۔ گائیں بھینسیں اونٹ، گدھے کتے اور گھوڑے بھی آدمیوں ہی میں گھسے نظر آتے تھے ایک اور میدان میں چھکڑے بیل گاڑیاں جمع ہو رہی تھیں۔ تاجور سامری اپنے بھائی کو ڈھونڈتا ہوا ایک کچی حویلی کے پاس پہنچا تو ایک کیکر کے پیڑ کے نیچے وہ اسے مل گیا۔ لبھی پاس بیٹھی گنا چوس رہی تھی۔ رام لال کے دو چھوٹے لڑکے بھی گنوں کا ڈھیر لگائے بیٹھے گنے چوس رہے تھے۔ تاجور سامری ابھی بیٹھا ہی تھا کہ اس کی ماں شاہنی رام لبھایا اور اسکی بیوی بھی آگئے۔ عورتیں آتے ہی چولھے چوکے میں لگ گئیں۔ اور رام لبھایا۔ نند کشور پانی لینے چلے گئے۔ اور رام لال اپنی اکھٹی کی ہوئی لکڑیوں کے ٹکڑے کرنے لگا —— تاجور سامری کا والد ابھی نہیں آیا تھا انکا زاد سفر اسکے پاس تھا اس کی ماں نے شاہنی سے آٹا اور دال ادھار لیکر اتنے کھانا بنایا۔

کھانے پینے سے نبٹ کر سونے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ایکھ کی خشک چھال اور سوکھا ہوا گھاس پھوس اکھٹا کرکے بچھایا گیا۔ اور اسپر کپڑے ڈالکر سب لیٹ گئے۔ اور باتیں ہونے لگیں۔ تاجور سامری کی سائیکل کے اگلے پہیئے سے ہوا نکل گئی تھی۔ وہ کسی سے پمپ مانگنے کے لئے چل دیا —— تھکاوٹ کے کارن جلدی ہی سب سو گئے۔ پو پھٹنے سے پہلے ہی چل چلاؤ شروع ہو گیا۔ تاجور سامری اور اس کے ساتھی بھی جاگے۔ اس کی تائی نکل

اب ٹھیک تھی وہ اسے دھکیل کر پیدلوں کے ساتھ چھکڑوں کے آگے نکلنے کی کوشش میں چل پڑا نند کشور اور رام لبھایا نے اسکا ساتھ دیا۔ ہوائیں خوشگوار ٹھنڈک تھی اور ہر چیز ابھی اونگھتی ہوئی نظر آتی تھی۔ درخت بے پروائی سے رک رک کر ہل رہے تھے۔ مویشیوں کی آوازوں چھکڑوں اور بیل گاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور گرد وغبار سے ایک عجیب سماں پیدا ہو گیا۔

تاجور سامری قافلے کے آگے چلنے والے پیدلوں میں شامل ہو گیا تھا۔ چند گھڑ سوار فوجی پیدل رائفلیں اور سٹین گنیں کندھوں سے لٹکائے آگے آگے چل رہے تھے۔ ہزاروں آدمیوں، بیشمار مویشیوں اور چھکڑوں کی بھانت بھانت کی آوازوں نے خاموشی کا طلسم توڑ دیا۔ چھوٹے جنگلی جانور، جو سڑک کے کناروں میٹھی صبح کی سہاونی ہوائیں سانس لے رہے تھے خوفزدہ ہو کر اپنے بلوں اور جھاڑیوں میں دوڑ دوڑ بھد بھد کر چھپنے لگے۔ جھاڑیوں کی ٹہنیوں پر اونگھتی چڑیا گھبرا کر دور جا بیٹھیں اور کوّے شور مچاتے ہوئے اونچے اڑنے لگے۔

تاجور سامری نے اپنی سائیکل سے بندھا ہوا ایک بوقچہ کھولا۔ اور اس میں سے پیتل اور تانبے کے بُت نکال کر بہتی نہر میں پُل کے چکّر کھاتے ہوئے پانی میں پھینک دیئے وہ ٹھاکر جو جگت تاریعنی دنیا کو پار لگانے والے کہے جاتے ہیں ایک دم غڑاپ کی آواز کے ساتھ ڈوب گئے۔

تاجور سامری برسوں سے خُدا اور اس کے ہر قسم کے تصور سے بری ہو چکا تھا لیکن کھلونے اس کی ماں کے مذہبی شغل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس نے یہ سوچ کر کہ اس سفر میں مشکل سے کام کی چیزیں اٹھا کر لے جائی جا سکتی ہیں۔ ان بے کار چیزوں کو اٹھانے سے فائدہ؟ ان کو پانی میں پھینک دیا

شہر میں ہوتا اور امن کا زمانہ ہوتا تو اس سیروں پیتل اور تانبے کے ڈھیر سے رُوپے بن سکتے تھے۔

تاجور سامری اب سائیکل پر سوار ہو کر قافلے کے آگے آگے جا رہا تھا لوگ اسے زیادہ دور اکیلا جانے کو روکتے۔ مگر وہ اپنی دھن میں غرق —— اور ڈرپوک لوگوں کی سب سنی ان سنی کرتا چلتا رہا۔

دوپہر سے پہلے یعنی کوئی دس بجے کے قریب وہ سب سے پہلے جڑانوالہ کی بڑی نہر پر پہنچ کر ادھر ہی رک گیا ——

پل کے پار اسے کچھ بلوچ فوجی اور مشرقی پنجاب سے آتے ہوئے مصیبت کے ماروں کا گروہ نظر آیا۔ یہ کوئی قافلہ ہوگا۔ وہ وہاں کھڑا ہو کر دور سے آتے ہوئے اپنے قافلے کو دیکھنے لگا۔

—— ایک بے پناہ شور اور گرد و غبار سے ادھر کی حد نگاہ دھندلا رہی تھی۔ اس شور کی دھمک سے نہر کے پاس کے درختوں کے جھنڈ میں چل بچل مچ گئی جنگلی جانور اور پرندے گھبراہٹ میں ٹھکانے چھوڑ ادھر ادھر بوکھلائے بوکھلائے پھرنے لگے۔ اب قافلہ بالکل نزدیک آگیا اور پار کے لوگ سڑک سے فرلانگ بھر ہٹ گئے۔ تاجور سامری سائیکل کا سہارا لیکر پل کے ساتھ ہی ایک طرف کھڑا ہو گیا تاکہ وہ اپنے بچھڑے ساتھیوں کو مل سکے۔ اب پیدل لوگ گزرنے لگے۔ اس نے دیکھا اب لوگوں کے چہروں پر وہ پہلے دن کی سی تازگی اور امنگ نہیں تھی۔ اس کی جگہ اب ایک تھکاوٹ اور امید و بیم کی پیدا شدہ پژمردگی تھی۔ جو رستے کی گرد کے غبارہ سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی۔ گزرتی ہوئی بھیڑ میں ہی اس نے رام لبھایا اور اسکی بیوی کو دیکھا۔ اس نے آواز دی مگر انہوں نے نہ سنا اور آگے نکل گئے اور تاجور سامری سائیکل کو چھوڑ کر ان کے پاس جا نہ سکا۔ اچانک نند کشور اور شاہنی اسکے پاس ہی گزرے۔ تاجور سامری نے پکارا تو وہ فوراً اسکے پاس آگئے نند کشور بولا۔ ارے تم کہاں ہو میں تو سمجھتا تھا تم اپنی ماں کے ساتھ ہو —— تاجور سامری نے کہا۔ نہیں میں پہلے پیدل کیمپ کے

خان صاحب! آپ کو غلط فہمی ہے۔ تقسیم کی حمایت کرنے والے شہروں میں ہوں تو ہوں، دیہات میں نہیں۔ مجھے تو یہی تجربہ ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں یہ اخبارات والے اگر بُری باتوں کو نہ پھیلائیں تو تقسیم اور اس کے بُرے نتیجے عملی صورت میں ظاہر ہو ہی نہ سکیں گے۔

پر ایسا نہ ہو تو بھی نا! لیکن افسوس تو یہ ہے ایسا ناممکن ہے۔ کیونکہ اخباروں پر انگریز کی چال کے حمایتیوں کا قبضہ ہے۔ جو مذہب کی آڑ میں اس آگ کو ضرور ہوا دیں گے تاجور سامری نے کہا،

شیخ صاحب بولے "اگر ہم اخبار پڑھنا ہی چھوڑ دیں تو!"

تاجور سامری۔ ایسا ممکن نہیں۔

خان صاحب! ہم نے تو ممکن کر دکھایا ہے۔ اپنے گاؤں میں۔ ہمارے ہاں "زمیندار" "پرتاپ" اور "راجیت" اخبار آتے تھے۔ لوگ ان کے خطرناک مضمونوں اور خبروں سے ڈرنے لگے تھے۔ میں نے ان کا داخلہ ہی روک دیا وہاں۔ اب ہم سب چین سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سردار جی۔ کچھ بھی ہو۔ لیکن حالات سُدھرنے کی امید نہیں۔ کیونکہ ہماری آواز بے اثر ہے اور ادھر بدلے کی ہوا اس آگ کو بھڑکا رہی ہے۔

شیخ جی! ہاں یہ بات بھی سوچنے کی ہے۔ کہ خرابی کرتے ہیں۔ نواکھالی والے مسلمان اور سزا ملتی ہے بہار کے مسلمانوں کو! اور پھر بہار کے ہندوؤں کی زیادتی کی سزا انہیں دینے کی جگہ پوٹھوہار کے غیر مسلموں کو دی جاتی ہے ——— عجیب منطق ہے۔

تاجور سامری نے کہا۔ شیخ صاحب یہ بھی انگریز کی چال کا ایک حصّہ ہے۔ اگر ہم اصل بات کو سمجھنے کی کوشش کریں تو بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ کوئی

ساتھ نکل آیا تھا۔ اچھا تو میری ماں کا تمہیں کوئی پتہ نہیں؟

شاہنی نے جواب دیا۔ اس کا پتا نہیں۔ پر کاش ضرور فوجی ٹرک پر ہمارے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ مجھے اس کی فکر زیادہ تھی۔ تاجور سامری اطمینان سے بولا۔

شاہنی نے کہا۔ وہ رام لبھایا اور راج کوشلیا کے ساتھ ہوگی۔ (رام لبھایا کی بیوی) "نہیں وہ تو ابھی یہاں سے گزر گئے ہیں۔ میں نے بلایا مگر میری آواز ان تک نہیں پہنچی۔

شاہنی نے کہا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ نند کشور کا پتا ان کے ساتھ ہوگا۔"

ضرور۔ تم نے روٹی تو نہیں کھائی ہوگی۔

نہیں، تاجور سامری نے بھیڑ کے ریلے سے بچتے ہوئے جواب دیا۔

شاہنی نے اسکو گڑ اور آٹے کی تلی ہوئی مٹھائی دی اور کہا۔ لو یہ کھا کر پانی پی لو۔

تاجور سامری نے وہ مٹھائی لے لی اور شاہنی کے لڑکے کو اپنے سائیکل پر آگے بٹھایا مگر ابھی وہ آگے نہیں نکل سکتا تھا بھیڑ چھٹے تو وہ آگے نکلے، تو یہی اس نے دھیرے دھیرے آگے بڑھنے کی کوشش جاری رکھی۔

ایک بابو نما شخص یک برس کے بچے کو اٹھائے روتا ہوا پھر رہا تھا۔ اور ہر ایک سے اپنی کھوئی ہوئی بیوی کا حلیہ اور لباس کا رنگ بتا کر پوچھتا کہ کسی نے کہیں اسکو دیکھا ہو! مگر وہاں کون سنتا تھا۔ ایک گھوڑا سوار فوجی سپاہی نے وعدہ کیا میں ابھی اس کی کھوج لگاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ پھر پیچھے کو لوٹ گیا۔

یہ قافلہ جو بیشمار انسانی سروں اور ٹانگوں کا لامتناہی سلسلہ تھا ایک ایسے بہت بڑے کنکھورے کی طرح تیزی سے بڑھا جا رہا تھا۔ جو اپنے دشمن جانور کو دور سے دیکھ کر کہیں پناہ کے لئے بھاگا جا رہا ہو۔ اب سورج سر پر آچکا تھا اور اکتوبر کا آخر ہونے کے باوجود دھوپ ناقابل برداشت حد تک تیز تھی چمکتی ہوئی کالی سڑک زہر خند کرتی محسوس ہوتی اور جنگلی درخت ایک مہربان اور ہمدرد ڈیرہ دار کی طرح محبت بھری نظروں سے

یہ کہتے محسوس ہوتے مسافرو، تھک گئے ہو! تو آجاؤ۔ دم بھر کو، سستا لو۔ ہمارے سائے انسانی مہربانی کی طرح نہیں جو وقت اور جذبات کے ساتھ بدل گئے ہوں، آؤ اتنی بھی کیا جلدی ہے راستہ طے تو ہوگا ہی اک ذرا دم لو۔ لیکن لوگوں کی محسوس کرنے کی طاقت گویا جواب دے چکی تھی۔ وہ اپنی تھکی نگاہیں دور نیلگوں افق پر ڈالے بڑھے جا رہے تھے،

اب جرانوالہ کا چھوٹا سا خوبصورت شہر نظر آ رہا تھا۔ اس کے کارخانوں کی چمنیاں اور مندروں مسجدوں کے کلس مینار سر اٹھائے ان خانہ بدوشوں کو حیرت اور حسرت سے دیکھ رہے تھے! اور شہر کی عمارتیں دور سے غمگین نظروں سے دیکھتی محسوس ہو رہی تھیں گویا کہہ رہی تھیں، اس گلزار کے رونقو! تم کہاں جا رہے ہو؟ ہم کوئی غیر تو نہیں ہو گئے۔ ہم سے یوں کھنچے کھنچے کیوں ہو، ہم وہی تو ہیں جنکو تمہاری حسن پرست نگاہیں چوما کرتی تھیں۔ مگر اب یہ بے اعتنائی کیوں! تم ہم کو چھوڑ رہے ہو ہم تو تمہیں نہیں چھوڑ رہے ——— مگر یہ لوگ بہرے ہو چکے تھے وہ صرف افق کی دعوت بھری پکار کو سن رہے تھے جو کہہ رہی تھی۔ بڑھے آؤ۔ بڑھے آؤ۔ رکنا نہیں۔ منزل دور ہے۔ بڑھے آؤ، اور یہ میلوں لمبا کنکھجورا سسکتا ہوا بڑھا جا رہا تھا۔

دوپہر ڈھل رہی تھی، تاجو رسامی اپنی سائیکل سے اتر کر ایک پیڑ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ شاہنی کا لڑکا اپنی ماں کے پاس جانے کے لئے ضد کر رہا تھا۔ تاجو رسامی اسی لئے رک گیا تھا کہ اس کا باپ بھائی یا ماں نظر آئے تو اسکو سونپ کر سکد وشی سے چل سکے۔ اچانک ایک ٹھیلا چلتے چلتے رک گیا۔ اسکے آگے جتی ہوئی بھینس نے زمین پر گرتے ہی دم دیدیا۔ اس جھٹکے سے ٹھیلے کا ایک کاٹھ کا پہیہ بھی ٹوٹ گیا۔ چلنے والوں نے ایک نظر اس حادثے کو دیکھا اور اپنی راہ چلنے لگے۔ ٹھیلے والا ایک طرف اداس ہو کر بیٹھ گیا۔ اچانک ایک ٹرک آکر رک گیا۔ بہت سی عورتیں اور آدمی ادھر لپکے۔ ایک تو ندل لالہ جی ٹھیلے کو اس حالت میں دیکھ کر اوپر سے پکارے

ارے یہ کیا؟ مرگئی بھینس۔

ٹھیلے والا جواب تک بجھا سا بیٹھا تھا۔ بھڑک کر بولا۔ تمہاری کرنی میرے آگے آگئی لالہ۔ تم تو دوسروں کا مال ہڑپ کرتے پھرتے تھے میں بوجھ لادنے میں مارا گیا۔۔۔۔۔ لالہ جی اسے آنکھوں اور ہاتھوں کے اشارے سے خاموش رہنے کی التجا کرتے ہوئے نیچے اتر گئے۔ اب بہت سے لوگ اس جگہ رک گئے۔ لالہ جی بولے۔ بھینس مرگئی تو کیا ہوا۔ اور لے دونگا۔ ہندوستان پہنچکر۔ دو آدمی اور لے ساتھ اور کھینچ دھکیل کر لے چلو۔

ٹھیلے والا۔ گرج کر بولا۔ لالہ تم آدمی نہیں بھوت ہو! اتنے بھاری ٹھیلے کو اتنے لمبے راستے میں کون کھینچ دھکیل کر لے جا سکتا ہے۔ تم نے لالچ کیا۔ بے ایمانی کی۔ کیمپ سے دوسروں کا سامان ہتھیایا اور راستے میں پندرہ پندرہ روپیہ ایک بوجھ کے لیکر میرا سیتا ناس کر دیا۔ میں تو اب تمہیں یوں نہیں چھوڑ دونگا۔ میرا تین سو روپیہ کا ٹھیلہ بیکار ہو گیا میرے تین سو روپیہ دے دو۔ اور چاہے بھاڑ میں جاؤ۔

بھیڑ میں سے کئی آدمی آگے بڑھے اور اپنے اپنے سامان کو پہچان کر ٹرک میں ڈالنے لگے ——— لالہ جی نے ٹھیلے والے کو ایک طرف لیجا کر نہ جانے کیا کہا۔ وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ اب یہ ایک فوجی سے کانا پھوسی کرنے لگے۔ اور وہ بار بار انکار میں سر ہلانے لگا ——— اب وہ پاؤں پکڑنے لگا۔ اور وہ فوجی ناراض ہو کر اونچی آواز سے بولنے لگا! یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم کو آدمی زیادہ بچانا ہے۔ لوٹ مار کا سامان نہیں۔ بھاگو، میں کچھ نہیں کر سکتا۔

لالہ جی نے اس کا رُخ ایک طرف موڑ کر جیب سے کچھ نکالکر دینا چاہا۔ فوجی نے جھپٹ کر وہ چیز چھین کر ہوا میں اڑا دی۔ یہ دس دس روپے کے کئی نوٹ تھے۔ فوجی اب گالیاں بک رہا تھا۔ سالہ بے ایمان، ہمیں رشوت دیتا ہے۔ بے ایمان پنجابی۔ یہ گڑبڑ دیکھ کر فوجی صوبہ دار اور دو سپاہی آگے بڑھے۔ اصل بات معلوم کر کے وہ بھی طیش میں

آگئے۔ اور اسے گالیاں دینے لگے۔ صوبہ دار نے اپنے ہنٹر سے اُسے پیٹنا شروع کیا۔ لوگ اس عجیب تماشے کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ مگر یہ بات ایک کونے میں ہو رہی تھی باقی قافلہ چلا جا رہا تھا۔ ایک شخص پکارا۔ یہ لالہ موٹی آسامی ہیں کیمپ میں دس روپے تولہ سونا انہوں نے لوگوں سے ہتیایا ہے۔ اور ہوائی جہاز سے ہندستان بھیجا ہے۔ اسکی اچھی طرح بیواکر دصوبہ دار جی ——— یہ سنکر وہ فوجی اور بھی بگڑ کے اور اسے مار پیٹ کر اپنا ٹرک لیکر چلتے بنے۔ تاجور سامری اس واقع سے اداس تھا اور اس بدمعاش کو سزا ملنے پر خوش ہی اچانک شاہنی کی آواز سنائی دی۔ اس نے دیکھا تو دونوں خاوند بیوی نظر آئے۔ اس نے جلدی سے لڑکا ان کے حوالے کیا۔ اور سائیکل پر سوار ہو کر چل پڑا ——— جڑانوالہ دور ہوتا ہوتا آخر درختوں کی ہریالی دوری میں کھو گیا، نہر کے پل سے گزر کر اب یہ لوگ سیم والی اونچے کنارے کی نہر کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ دوپہر ڈھل گئی تھی۔ اور درختوں کے سائے پھیلنے شروع ہو گئے تھے۔ پیدل بہت آگے نکل چکے تھے۔ اب تاجور سامری لائلپور ضلع کے جاٹوں کے چھکڑوں کی قطار کے ساتھ چل رہا تھا۔ بیشمار بھینسیں گائیں گھوڑے گھوڑیاں بکریاں گدھے رہ رہ کر بولتے پکارتے گرد اڑاتے جا رہے تھے۔ گرد اور گرمی نے پیاس کو خوب چمکایا۔ حلق میں کانٹے پڑنے لگے تو تاجور سامری نے ایک سکھ جاٹ سے پانی مانگا۔ وہ جھلا کر بولا۔ تمہیں پانی دوں؟ تم لالوں کو تو ایسی جگہ ماروں جہاں پانی نہ ملے! جاؤ جواہر لال سے پانی مانگو! جس نے ہمارا ستیاناس کیا ہے! گاندھی کو پکارو! میں تمہیں پانی نہیں دونگا! تم لالوں اور پنڈتوں نے ہمیں برباد کر دیا ہے ——— ابھی جاٹ چپ بھی نہیں ہوا تھا دوسرا چھکڑے سے کود کر نیچے آیا۔ اور کڑک کر بولا۔ جان کی خیر چاہتا ہے تو ہٹ جا میری آنکھوں کے سامنے سے۔ میں سر گھسوں کو دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ تم نے ہر جگہ ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے! اچھا بچہ جواہر لال تجھے ہم ہندوستان پہنچکر بتائیں گے۔ کہ ہم کیا کر سکتے ہیں!

تاجور سامری حیران تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے! جواہر لال کی خطا کا بدلہ مجھ سے کیوں لیا جا رہا ہے گاندھی اور دوسرے بنیوں کی مکاری کی سزا سارے ہندوؤں کو کیوں دی جا رہی ہے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک جاٹ نے اپنا چھکڑا اسپر چڑھاتے ہوئے کہا۔ ہٹتا ہے آگے سے کہ مرنے کی ٹھانی ہے؟ تاجور سامری گھبرا کر وہاں سے سائیکل لے کر بھاگا۔ اور بہت جلد پیدل چلنے والوں سے مل گیا۔

ابھی سورج کافی اونچا تھا۔ پانچ بجے ہوں گے! تاجور سامری پڑاؤ پر پہنچا۔ ندی کے کنارے اور بیچ کی سڑک کے کنارے پر لوگ ڈیرے ڈال رہے تھے۔ ایک وسیع میدان میں گدڑے مویشی جمع ہو رہے تھے۔ تاجور سامری قافلے کے بالکل اختتام پر آگیا۔ ایک خالی کھیت میں۔ محافظ ملٹری کے ٹرک کھڑے تھے ایک ٹرک میں ان کا افسر بیٹھا تھا تاجور سامری کوئی اچھی سی جگہ تلاش کر رہا تھا، اچانک اسے کسی نے پکارا اس نے پلٹ کر دیکھا تو لائلپور کے ماسٹر لچھمن داس نظر آئے، وہ بولے کدھر منہ اٹھائے پھر رہے ہو تمہارے پتاجی تو ہمارے پاس بیٹھے ہیں ——— اچھا! تاجور سامری کے حیرت اور خوشی کے ساتھ کہا۔ یہ کہہ اس کے ساتھ ہو لیا۔ راستے میں ملک کندن لال مشہور دہشت پسند ملے اور چھوٹتے ہی بولے تم کیسے غیر ذمہ دار ہو، تمہارا بیمار بھائی دو گھنٹے سے ہمارے پاس بیٹھا ہے۔ اسکی تمہیں کوئی فکر نہیں! تاجور سامری نے ان سے معذرت کرتے ہوئے پوچھا کہاں ہے وہ! ملک صاحب بولے کہاں ہے۔ وہ دیکھو پڑا ہے نہر کے کنارے! تاجور سامری نے ادھر دیکھا تو نہر کے اونچے کنارے پر اپنے بھائی کوی پرکاش کو لیٹے پایا۔ اس نے مسٹر لچھمن داس سے کہا آپ پتاجی کو ادھر بھیج دیجیے۔ میں بھائی کی سدھ بدھ لوں ——— یہ کہہ وہ اپنے بھائی کے پاس آیا۔ کوی پرکاش اُسے دیکھتے ہی خوشی سے اٹھ بیٹھا۔ تاجور سامری نے پوچھا۔ پتاجی بھی آگئے ہیں۔ کوی نے خوشی ہو کر پوچھا۔ کہاں ہیں وہ! تاجور سامری کچھ کہنے

ہی کو تھا کہ کرپارام لاغر ایک بقچہ کندھے پر ڈالے پاس آکر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ کیسے ہو مڑ کو!
ماں کہاں ہی تمہاری! گوپی پرکاش نے جواب دیا، میں تو فوجی ٹرک سے آیا ہوں۔ آ ہی رہی ہونگی
کرپارام لاغر نے کہا۔ آیا تو میں بھی ٹرک سے ہوں لیکن راستے میں نظر نہیں آیا کوئی بھی۔ حالانکہ
میں ہر طرف غور سے دیکھتا آیا ہوں۔

تاجور سامری نے جواب دیا کون نظر آسکتا ہی اتنی بھیڑ میں، آتی ہی ہونگی تم سب بیٹھو
میں دیکھتا ہوں ان کو، شاید آگئی ہوں، یہ کہہ کر وہ پھر اس طرف چلا جدھر سے آیا تھا۔
لوگ آرہے تھے۔ اور آتے ہی خالی جگہوں پر ڈٹتے جا رہے تھے۔ نہر کے پار کا چٹیل میدان
ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ دور ایک ٹیلے پر بھیڑ بکریاں چرتی نظر
آرہی تھیں۔ اور نہر کا صاف پانی اب ان گنت ہاتھوں اور مویشیوں کے گھنگالے جانے
سے گدلا ہوگیا تھا۔ آج سعز مینا کا فوجی ٹیوب انجن کام نہیں کر رہا تھا۔ تاجور سامری
نے ایک طرف رام لبھایا کو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ پاس جا کر پوچھا
دوسرے ساتھی کہاں ہیں: رام لبھایا نے جواب دیا۔ میں تو ان کے ساتھ ٹرک سے آیا
ہوں تمہاری ماں اور لبھی کو جڑانوالہ سے اِدھر کی نہر پر سے گزرتے دیکھا تھا ———
ہمیں یہاں آئے ڈیڑھ گھنٹہ سے زیادہ ہوگیا ہی۔ اور وہاں سے یہاں تک سفر گھنٹہ
بھر سے زیادہ کا ہرگز نہیں۔ وہ آتی ہوگی ——— اور رام لال شاہی وغیرہ؟
تاجور سامری نے پوچھا۔

اوہ! ——— ان کی مجھے کوئی خبر نہیں اور نہ آئندہ میں ان سے کوئی سروکار
رکھوں گا ہی ——— رام لبھایا نے دل کے کسی گہرے زخم کو چھپاتے ہوئے کہا

تاجور سامری نے پوچھا۔ کیوں! وہ تو تمہارا بڑا بھائی ہی۔
کچھ بھی ہو مجھے اس کی طبیعت بالکل پسند نہیں۔ اس کی ڈھٹائی بے ایمانی اور
کرخت مزاجی مجھے ذرا بھی نہیں بھاتی ——— تم کہو گے بڑے بھائی کی چغلی کھاتا ہے

لیکن تم ہی بتاؤ جب وہ ایسے کام کرے جس سے بدنامی ہو آدمی قانون اور سماج دونوں کی نظروں میں مجرم بنے تو ایسے تعلقات سے فائدہ ! —— کیمپ میں لوگوں کا سامان اِدھر اُدھر کر دیتا تھا۔ سٹوروں سے لکڑیاں اور گڑ چرا کر بیچتا تھا۔ آج وہ جڑانوالہ کے موڑ پر بیٹھا راشن کا آٹا فروخت کر رہا تھا —— میں تو ایسی حرکتیں برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ وہ پانی لینے چلا گیا۔ تاجور سامری اپنی ماں اور بھابھی کو ڈھونڈتا بھالتا ڈیرے کو لوٹا تو وہاں ان دونوں کو پایا۔ اس کا باپ کرپارام لاغر اپنی آدھا دن اور ایک رات کی آپ بیتی سنا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا راستے میں اس کا ایک پرانا واقف مسلمان جانگلی مل گیا۔ بڑی دیر تک سڑک کے ایک طرف بیٹھے دکھ سکھ کی کہتے رہے۔ اور رخصت ہوتے وقت اس نے پانچ سیر گڑ اور گنے چوسنے کو دیئے گوپی پرکاش اور للی بھی گنے چوس رہے تھے۔ کرپارام لاغر اٹھ کر پانی لینے گیا۔ ماسٹر لچھمن داس اونچی آواز سے بولے۔ سامری صاحب راشن لے آؤ۔ چوکی پر تقسیم ہو رہا ہے۔ تاجور سامری ماں کے کہنے پر اُدھر چل دیا۔

فوجی افسر کے تنبو کے پاس آٹے اور چاول کی کھلی بوریاں رکھی تھیں۔ اور سپاہی جلدی جلدی لوگوں کی جھولیوں میں ہاتھوں سے آٹا اور چاول ڈال رہے تھے۔ ایک حوالدار کہہ رہا تھا۔ ضرورت سے زیادہ اناج نہ لینا بھائیو! ابھی ہمیں کئی دن سفر میں رہنا ہے۔ کوئی چیز ضائع نہ ہو۔ راشن ضائع کرنے والے کو سخت سزا دی جائیگی —— تاجور سامری بھیڑ چھٹنے کے انتظار میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اچانک ایک طرف سے شور اٹھا۔ حوالدار پکارا۔ کیا بات ہے! ایک شخص نے جواب دیا۔ یہ شخص یہاں سے راشن لیکر لوگوں میں بیچ رہا تھا۔

حوالدار نے غضبناک ہو کر کہا۔ بے ایمان! اس مصیبت کی حالت میں بھی حیران کرنے سے باز نہیں آتے۔ ادھر لاؤ اُسے! لوگوں نے اس شخص کو دھکیل کر آگے کر دیا۔ وہ ایک گناہ گار کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ مردہ کی طرح زرد تھا۔

حوالدار نے پوچھا تم نے راشن کیوں بیچا۔

وہ شخص بولا۔ پیسوں کی ضرورت تھی۔

ایک شخص کہنے لگا۔ جناب یہ تو اس کام کے لئے کیمپ بھر میں مشہور ہے۔ یہ آج کوئی نیا کام نہیں اس کے لئے۔

حوالدار نے یہ سنکر غضبناک ہو کر اس پر ٹوٹ پڑا۔ اور اُسے تھپڑوں اور گھونسوں سے پیٹنے لگا۔ تاجور سامری سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ اور وہ راشن حاصل کئے بغیر ہی ڈیرے کو لوٹ گیا ماں نے پوچھا راشن نہیں لائے، تاجور سامری ٹال گیا۔ اس کی ماں نے کہا۔ میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا ورنہ راشن تو ابھی ہمارے پاس پورے ہفتے کا موجود ہے۔

کھانا پینا ہو چکا تو نہر کے ہموار کنارے پر چادر اور کمبل بچھا سب لیٹ گئے تھکاوٹ کے کارن جلدی ہی نیند آ گئی۔

تاجور سامری ایک عجیب سپنا دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ بیشمار لوگ جو خون میں لت پت تھے۔ بعضوں کے پیٹھ میں چھرے اور برچھیوں کے گھاؤ منہ کھولے خون اگل رہے تھے بعضوں کے سر ہی نہیں تھے۔ زمین و آسمان ایک کرنے ہوئے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آ جا رہے تھے۔ زمین خون سے لال تھی، آسمان شعلوں سے سُرخ ہو رہا تھا تیز تیز اور سرد ہوا سے درخت اکھڑ رہے تھے۔ اور وہ لوگ ایک خوفناک دھن الاپ رہی تھی تاجور سامری اس ہولناک نظارے کی تاب نہ لا سکا اسے محسوس ہوا جیسے یہ طوفان اسکو کچل دیگا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا ——— آنکھیں کھلیں۔ رات کے آثار مٹتے پائے مشرق میں سہانی صبح مسکرا رہی تھی اور قافلہ کوچ کر رہا تھا۔ ڈیرے اکھڑ رہے تھے۔ چھکڑے بھاگے جا رہے اور مویشیوں کی آوازوں سے آسمان اور زمین گونج رہے تھی تاجور سامری کا اپنا ڈیرہ بھی اکھڑ چکا تھا۔ اس کی ماں کھانا تیار کر چکی تھی۔ اسے جاگتا پا کر کہا۔ لو تمہارے ساتھی تو گئے کیا آج تم ہمارے ساتھ رہو گے؟ تاجور سامری نے کہا۔ نہیں میں پیدلوں کے ساتھ چلونگا۔ میرا کھانا دیدو ——— وہ اپنا کھانا لے کر

سائیکل پر سوار ہو کر چل پڑا ـــــــ دوپہر سے پہلے ہی قافلہ نکّے کی قریب سے گزر رہا تھا
اڈے کا بازار جرنیلی سڑک کے دونوں کناروں پر آباد تھا۔ بہت سی دکانیں کھلی تھیں۔ شراب اور
پھل کی دکانیں زیادہ کشادگی سے آنے جانیوالوں کو نظارے کی دعوت دیتی تھیں۔ تاجور سامری
نے ایک دکان سے انگور خریدنے چاہے۔ مگر دکاندار نے تین روپے سیر بھاؤ بتایا۔ وہ ناامید ہو کر
پلٹنا ہی تھا کہ دوسرے دوکاندار نے آواز دی بابوجی مجھ سے لیجئے انگور۔ یہ تو پناہگزین ہے
اس کا تو دماغ خراب ہے۔ اسی لئے اس کا سودا نہیں بکتا۔

پہلا دکاندار چڑھ کر بولا: جی ہاں میں پناہگزین ہوں۔ میں ڈنکے کی چوٹ سے کہتا
ہوں کافروں کے ہاتھ سودا نہیں بیچوں گا۔ بیچونگا تو چوگنے داموں جس طرح ہم بے بسوں سے
ایک ایک روٹی کی قیمت پوربی پنجاب کے ہندو سکھ دوکانداروں نے ایک ایک روپیہ
وصول کی ہے ـــــ تم دیتے رہو سستے داموں انگور۔ تمہیں کیا پڑی ہماری۔ جس
تن لاگے سو تن جانے ـــــ وہ اسی طرح بڑبڑاتا رہا۔ اور تاجور سامری نے
دوسرے دکاندار سے سوا دو روپیہ سیر کے حساب سے پاؤ بھر انگور تلوائے اور آگے بڑھا
تو اس نے دیکھا چار آدمی کھڑے شراب کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہہ سن رہے ہیں۔ آخر
ایک آدمی محافظ فوجیوں کی نگاہ سے بچتا ہوا دکان کے چوبی کٹہرے کے پاس چلا گیا۔
اس کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا۔ چوتھا وہیں کھڑا رہا۔

تاجور سامری نے دیکھا کہ دکاندار نے دو بوتلیں سنگترہ کی اسے دیں۔ انہوں نے ہاتھوں
ہاتھ لیکر تہمد میں چھپا لیں۔ پہلے نے پھر دکان دار کو کچھ کہا جس پر وہ اندر گیا۔ اور یہ تینوں
بھاگے ہوئے بھیڑ میں غائب ہو گئے۔ دکاندار گھبرا کر باہر نکلا۔ مگر یار لوگ اپنا
کام کر کے جا چکے تھے۔ اب بچارا کیا کرتا۔ موٹی موٹی گالیاں بکنے لگا۔ کافر۔ بے ایمان
اچھا ہوا بدبخت پاکستان کو چھوڑ رہے ہیں ان پر ہزار لعنت ہو۔ بچارا بک جھک کر پھر اپنی
جگہ بیٹھ گیا۔ اب تاجور سامری بھی انگور کھاتا ہوا چلنے والوں میں مل گیا۔

سائے پیروں تلے چھپ گئے تھے۔ دھوپ کی تیزی سے حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہے تھے۔ ایک جوہڑ راستے میں نظر آیا سب اس پر ٹوٹ پڑے اور وہ پانی جو تھوڑی دیر پہلے قدرے صاف تھا اب کیچڑ ہو کر رہ گیا۔ مگر لوگ تھے کہ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ مار دھاڑ چیخ و پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ تاجور سامری نے اُوب کر اپنے سائیکل کی رفتار کو تیز کیا۔ اور سڑک کے کنارے درختوں کے سائے میں اپنا سفر طے کرنے لگا، کھیت اجڑی ہوئی دلہن کی طرح نظر آرہے تھے اور نالے خشک، درختوں کی ہریالی پر بھی گرمی کا اثر ظاہر ہو رہا تھا۔ سڑک سے ہٹ کر ایک بھینس ادھ موئی سی پڑی تھی جسے اس کا مالک بیکار سمجھ کر چھوڑ گیا تھا۔ اس سے پرے ایک بیل کی لاش تھی جس پر کتے عیش کر رہے تھے۔ اس سے کچھ ہی پرے حریص گدھوں کی ٹولی تھی جو اس بھیڑ کو دیکھ کر اپنے محاذ سے ذرا ہٹ گئی تھی۔ گدھ قافلے کو حیرانی اور خوف سے دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہے تھے۔ کیا دیکھ رہے تھے۔ شاید ان انوکھے مسافروں کی اس بھیڑ کو رحم کی نظروں سے یا پھر ان بیشمار جانداروں میں موت کا شکار ہونیوالوں کو پہچان رہے تھے ——— تاجور سامری یہ سوچ رہا تھا کہ اچانک ایک چیخ سن کر چونک پڑا۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک گڑھے کے کنارے پر ایک جوان سکھ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اسکی گھوڑی کی ٹانگ گڑھے میں گرنے سے ٹوٹ گئی تھی۔ گھوڑی تکلیف کی شدت سے تڑپ رہی تھی۔ اور کنارے پر سکھ بچھیری اپنی ماں کی تکلیف پر تڑپ رہی تھی۔ گھوڑی کے مالک نے کئی لوگوں سے مدد کی درخواست کی مگر کسی نے اسکی التجا پر کان نہ دھرا آخر ایک دو آدمی اسکی مدد پر آمادہ ہو گئے۔ اور بڑی مشکل سے گھوڑی کو گڑھے سے نکالا۔ اس کشمکش میں گھوڑی کا بدن چھیل گیا تھا۔ اور ٹانگ اپنی جگہ سے الگ ہو گئی۔ ایک شخص بولا۔ اب یہ گھوڑی بیکار ہو گئی ہے۔ چھوڑ دو اسے اور بچھیری کو لے چلو ——— گھوڑی کے مالک نے کہا اس کو گولی مروا دو ——— تکلیف سے چھوٹ جائیگی ——— یہ سن کر پاس کھڑے ایک

سوچنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔

سردار جی۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ طوفان جس کی خونی للکاریں پنجاب کے آس پاس گونج رہی ہیں، کسی وقت بھی یہ کمزور بند توڑ کر اس گلزار میں آگر قیامت ڈھا سکتا ہے۔

تاجور سامری۔ بے شک۔

اس بات سے تینوں افسردہ ہو گئے۔ خاص طور پر شیخ جی کا چہرہ سفید ہو گیا تھا اتنے میں گاڑی نے چلنے کا اعلان کیا۔ اور سب اک لمحہ کیلئے اپنے موضوع سے ہٹ گئے۔ شیخ جی بولے۔ آج تو گاڑی نے جیسے یہیں رہنے کی ٹھان لی ہے۔

خان صاحب۔ دوسری وسل تو ہو چکی! اتنے میں تیسری وسل ہوئی اور گاڑی چل پڑی۔

سردار جی بولے۔ لیجئے چل ہی پڑی۔ لیکن آج تو پورا ڈیڑھ گھنٹہ رُکی رہی گاڑی؟

خان صاحب! لائن میں کوئی خرابی ہو گی۔ آجکل فسادوں کا زمانہ ہے۔

شیخ صاحب نے کہا۔ خدا نہ کرے۔ میری تو رُوح لرزتی ہے۔ اس وقت کے تصور سے میں یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ ہندو اور مسلمان اپنی صدیوں کی محبت کو انگریز کی اس چال پاکستان پر قربان کر دیں گے۔ تاجور صاحب آپ حیران ہونگے میرے گاؤں میں کوئی شخص اس قسم کی بات ہی کرنا چاہتا۔ صرف گاندھی جی کا نام سُنا ہے اور وہ بھی کھدر کے سلسلے میں۔

مولوی صاحب مخالفوں کی بھیڑ میں کچھ نہیں کر سکتے تھے لیکن سخت پریشان نظر آتے تھے۔ کبھی کھڑکی سے گردن نکال کر جھک جاتے کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتے اکثر غصے سے رہ رہ کر ہونٹ چباتے اور کچھ بس نہ چلتا تو ڈاڑھی کے بال نوچنے لگتے۔ تسبیح کی

بھگت جی بولے۔ ہری ہری۔ یہ اندھیر نہ کرنا۔ بے زبان کی جان لوگے۔ جس نے اتنی خدمت کی تمہاری ہرے رام رام انسان کتنا مطلبی ہے۔

وہ تینوں نادم سے ہو کر بولے۔ "پھر کیا کریں لالہ جی!"

بھگت جی۔ کر دیئے گیا: اب؟ چھوڑ دو اسکو اسکی قسمت پر۔ بچتا ہوا تو بچ جائے گی ورنہ اپنی موت تو مرے گی۔

گھوڑی کے مالک نے کہا۔ بھگت جی ٹھیک ہے۔ یہ کہہ اس نے بچھیری کے گلے میں رسا ڈالا۔ اور گھوڑی کی زین اُسپر کس دی۔ اور اسے کھینچکر لے چلا۔ البتہ بچھیری کے لئے یہ زین اور رستے کی مصیبت بالکل نئی تھی۔ اس کے لئے بہت احتجاج کرا۔ گ ... بے بس تھی۔ ناچار کھنچتی گئی۔ ان کے ساتھ چل پڑی اور زخمی گھوڑی حسرت اور تکلیف سے نڈھال پڑ گئی ——— تھوڑی دور جا کر بچھیری چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو کر پھر اپنی ماں کے پاس گئی۔ گھوڑی اپنی بچی کو دیکھ کر ہنہنائی۔ اور خوشی کے اظہار کے لئے سر اٹھایا۔ مگر اسی میں وہ پھر گرفتار ہو گئی اور گھوڑی پھر دکھ اور مایوسی کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی ——— تاجور سامری کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر پھر چل پڑا۔

کئی میل چل کر اچانک قافلہ ایک اجنبی سے رُخ کو مڑا۔ سڑک قدرے تنگ ہو گئی تھی۔ اور اس کے دونوں کناروں سے ذرا ہٹ کر خاصی کھلی زمین پڑی تھی جہاں پڑاؤ پڑنے کے آثار نظر آتے تھے۔ غالباً اس سے پہلے کے جانیوالے قافلوں نے یہاں رات بسر کی ہوگی۔ دوسری طرف قبرستان تھا کئی لوگ ادھر سایہ دار درختوں میں جا کر بیٹھ گئے۔ تاجور سامری بھی ایک صاف سی جگہ پر بیٹھ گیا۔ ابھی قافلہ خاصا دور تھا۔ ان بیٹھنے والوں کا خیال تھا شاید آج یہیں پڑاؤ ہو۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ایک فوجی نے پکار کر کہا۔ یہاں مت بیٹھو پڑاؤ آگے کی ہیڈ پر ہوگا یہاں اس طرح بیٹھنا خطرناک ہے۔ سب یہ سُنکر

گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ اس سے پہلے جو جگہ سہانی نظر آتی تھی اب خوفناک محسوس ہونے لگی۔ خاص طور پر قبرستان سے نہایت ڈر لگنے لگا۔ تاجور سامری نے جلدی سے اپنی سائیکل اٹھائی اور سڑک کی اونچائی کی طرف چل پڑا۔ یہ اونچائی پاس کی نہر کے پل کی وجہ سے تھی۔ پیدلوں کی بھیڑ بہتات ہو گئی اور سب ملکر چلنے لگے۔ سڑک ٹوٹی پھوٹی اور گڑھوں سی معمور تھی۔ کہیں کہیں فوجی ٹرکوں کے تلے کچلے ہوئے کتوں کی لاشیں چپکی ہوئی تھیں۔ سڑک سے ہٹ کر کہیں کہیں بھینسوں بیلوں اور گھوڑوں کے ڈھانچے پڑے تھے۔ کہیں تازہ لاش بھی دکھائی دیجاتی جسپر گدھ اور کتے قابض نظر آتے۔ ایک بڑے بھینسے کی لاش پر گدھ جمع تھے۔ تاجور سامری نے للکارا تو گدھ ایک طرف ہو گئے، اور لاش کی پیٹھ کے شگاف سے ایک لومڑی نکل کر بھاگ گئی۔ اور تاجور سامری گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

چار بجے کا وقت ہوگا! قافلے کا پیدل حصہ سیم کی نہر کے کنارے آ پہنچا۔ بلوکی ہیڈ یہاں سے دو میل تھا۔ نہر میں دریا کی طغیانی کا پانی تھا۔ دوسری طرف کی ڈھلواں زمین بھی نیم دریا کی تصویر بنی تھی۔ سرکنڈوں اور کریر کے جھاڑ پانی میں کھڑے لہرا رہے تھے۔ اس عظیم بھیڑ کی آمد سے اس بن کے سکون میں طوفان آگیا۔ چھوٹے چھوٹے جنگلی جانور پاس کی جھاڑیاں، دربل چھوڑ کر بھاگ نکلے تاجور سامری ان سب سے آگے تھا۔ اس نے دیکھا کہ سڑک کے ایک طرف سفر مینا کے ٹرک کھڑے ہیں جن کے پاس گڑھوالی سپاہی اور چند افسر مستعدی سے کھڑے ہیں۔ ایک فوجی نے پکار کر کہا "آگے نہیں جانا ہے آج پڑاؤ یہیں رہیگا!" تاجور سامری نے پوچھا۔

فوجی نے جواب دیا۔ ہاں ——— راستہ چھوڑ کر ڈیرا لگاؤ۔

تاجور سامری پلٹ کر نہر کے کنارے آیا ایک شیشم کے پیڑ کے نیچے ایک نئی چارپائی جس کے بان میں سے ایک پٹی اور ایک سرہانا پایوں سمیت نکال لیا گیا تھا۔ اسے ملی ——— اسی بان کو بستر قرار دیکر تاجور سامری اسپر لیٹ کر تھکان دور کرنے لگا۔ نہر بہت چوڑی تھی جب پانی سے بھرپور ہوگی تو کتنی ڈراؤنی ہوگی۔ اس نے خوف سے جھرجھری لی اور پھر دوسری طرف کے ڈھلوان زمین کے پانی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس پر سورج کی سنہری روشنی اور ہرے درختوں کے سائے اور

بیچ کھڑے جھاڑ عجیب بہار دے رہے تھے۔ اس پانی سے کچھ دور آبادی کے آثار نظر آتے تھے۔ اور نہر کے پار درختوں اور جھاڑوں کا وسیع جنگل جس پر بعد دوپہر کا نیلا آسمان تھکے ہوئے بوڑھے کی طرح جھکا ہوا تھا۔ ——— کچھ دیر تک لیٹے رہنے کے بعد تاجور سامری نے اٹھ کر سارے بدن کو تان کر جماہی لیتے ہوئے ہاتھ کی انگلیاں چٹخائیں اور مغرب کی طرف مٹتی ہوئی شفق کو دیکھا ڈھلواں زمین کا پانی اس سے گلابی ہو گیا تھا۔ سورج ڈوبنے کے باوجود ابھی روشنی خاصی تھی۔

حفاظت کی فوجی چوکی اٹھ کر فرلانگ بھر اور آگے چلی گئی اور اس کی جگہ لوگوں نے ڈیرے ڈال دیئے۔ ادھر قافلے کے باقی ماندہ لوگ آنے ابھی نہیں رُکے تھے لیکن اب وہ شدت نہیں تھی البتہ مختلف آوازوں پکاروں اور بلاوؤں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بھٹکے ہوئے لوگ اپنے ساتھیوں کو نام رشتے داروں کو لقب سے اونچے گلے سے پکار رہے تھے۔

تاجور سامری دور تک قافلے کے پیچھے کی طرف اپنے ماں باپ بھائی کو ڈھونڈنے چلا گیا لیکن ان کی کوئی خبر نہ ملی۔ اندھیرا زیادہ ہو چکا تھا۔ اور ابھی چاند نہیں نکلا تھا۔ وہ اپنے ڈیرے کو لوٹا ہر کمین لیمپوں چراغوں اور الاؤں کی روشنی اس اندھیرے کا مقابلہ کر رہی تھی خانہ بدوشوں کے ڈیرے میں کوئی ڈھولک اور سارنگی پر گا رہا تھا۔ تاجور سامری آکر اپنے ڈیرے پر بان کے بستر پر لیٹ گیا۔ اُس نے یہ فرض کر کے دل کو دھارس دی کہ بچھڑے ساتھی یہاں پہنچکر کہیں پڑ گئے ہونگے۔ صبح مل جائینگے۔ اپنے ساتھیوں کو پکارنے کی آوازیں بڑھتے بڑھتے پھر دھیرے دھیرے ختم ہو گئیں۔ تاجور سامری نے کھانے کی پوٹلی کھولی، پیٹ بھر کر کھایا اور پھر لیٹ کر آزاد ہندوستان کے تصور میں کھو گیا ——— وہ سفر کی تکلیفوں اور دشواریوں کو اس خوشگوار امید پر برداشت کر رہا تھا کہ اپنے نئے وطن پہنچکر آزادی اور خوشحالی کی فضا میں سانس لیتے ہی یہ سب باتیں بھول جائیں گی۔ یہ سوچتے ہوئے ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں نے اسے نیند کی گود میں ڈال دیا۔

شور و غل کی شدت سے تاجور سامری کی آنکھ کھل گئی۔ سورج کی کرنیں ہر چیز کو

سنہری رنگت دے رہی تھیں۔ اور قافلہ کوچ کی تیاریوں میں تھا لوگ اپنے بوریئے بند ھنے باندھ بوندھ کر ایک لمبی قطار میں بڑھے جا رہے تھے، تاجور سامری بھی جلدی جلدی تیار ہوا۔ سائیکل کی ہوا کی جانچ کی اور اطمینان کر کے چل نکلا۔ نند کشور نے پیچھے سے اُسے پکڑ لیا، اور کہا ایسی بھی کیا جلدی ہے! چلتے ہیں دھیرے دھیرے۔ تاجور سامری نے پلٹ کر اُسے دیکھا اور کسی قدر حسرت اور خوشی سے مسکرا کر پوچھا۔ ابھی آ رہے ہو؟ ..... نہیں یہیں سویا تھا رات کو! باقی ساتھی پیچھے رہ گئے تھے، نند کشور نے جواب دیا۔ پھر اب کہاں مل سکیں گے ہم شاید وہ چلیں بھی دیر سے ——— تاجور سامری نے اُداس لہجے میں کہا۔ نند کشور بولا، ان کی چنتا نہ کرو۔ وہ آ جائیں گے۔

اب ذرا قدم تیز کرو۔ چھکڑے اور مویشی آ رہے ہیں۔ چلنا دوبھر ہو جائے گا۔

تاجور سامری چپکے سے اسکے ساتھ ہو لیا۔ اُس کے دماغ میں اس وقت اپنے بہائی کوی پرکاش اور ماں کا خیال تھا جسے کل پیچش کی شدید شکایت تھی۔

نہر کے کنارے کنارے چلتے ہوئے لوگ بلوچی ہیڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور بعضوں کے دل میں کئی قسم کے وسوسے اور خدشے سر اٹھا رہے تھے۔ ایک سڑاچی سہمے سے لہجے میں کہہ رہے تھے، شیر سنگھا! ذرا گدڑے کے پچھلے حصے پر ہوشیاری سے بیٹھنا، کہتے ہیں ہیڈ پر بلوچ ملٹری تلاشی لے گی۔

ایک اور لالہ جی اپنے ساتھی سے رازدارانہ انداز میں کہہ رہے تھے بھائی! اپنی جوکھوں کی پوٹلی کو سب کپڑوں کے نیچے ہموار کر کے باندھ لو۔ تلاشی ہوگی۔ ہیڈ پر پھوٹی کوڑی بھی نہ چھوڑیں گے۔ بلوچ فوجی۔

تاجور سامری یہ سنکر سہما جا رہا تھا اس کی جیب میں اسّی روپے تھے اور یہی اس کی کل امید تھی۔ اُسنے بٹوے کو اوپر کے کرتے کی جیب سے نکالا۔ اور نیکر میں آگے کی طرف ٹھونس لیا اور گلو بند باندھ لیا ——— نند کشور نے اپنی سونے کی انگوٹھی آزار بند

کے ساتھ باندھ کر شلوار کے نیفے میں بھر لی ـــــــ پھر اطمینان سے چل پڑے۔ اب ایک کچا سا پل جس پر پھاٹک لگا تھا۔ گزرنا تھا۔ گڑھوالی جوان دونوں طرف رائفلیں تان کر کھڑے ہو گئے اور لوگ گزرنے لگے۔ ایک دستہ فوج ساتھ تھا آگے آگے یہ پتلی سی پکی سڑک فرلانگ بھر لمبی تھی سامنے ہی دریا کا پختہ عالیشان پل نظر آ رہا تھا اور پانی کے زور سے کہیں گرنے اور کسی چیز سے ٹکرا کر گرجنے کی خوفناک آواز آ رہی تھی، اس پتلی سی سڑک کے دونوں طرف سرکنڈوں کی گھنی باڑ تھی۔ لوگ اس خوف سے مرے جاتے تھے کہ کہیں ان میں دشمن چھپا نہ ہو۔

قافلے کے پیدل دستے کو آتے دیکھ کر پل کے محافظ بلوچ سپاہی جو تعداد میں بائیس تھے چوکنے ہو گئے۔ پہلی کھیپ پل کے پاس جا کر رک گئی۔ گڑھوالی حوالدار چلا کر بولا۔ رک کیوں گئے چلے چلو، اس کے ساتھ ہی پانچ جوان سٹین گن لئے پل کے دروازے کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ لوگ اب بے کھٹکے گزرنے لگے۔ وہ بلوچ سپاہی ایک طرف دبکے بیٹھے تھے۔ تاجور سامری چاروں طرف دیکھتا ہوا اطمینان سے چلا جا رہا تھا۔ ایک بھینس طاقتور لہروں اور بہاؤ سے لڑتی ہوئی دوسرے کنارے لگنے کی کوشش کر رہی تھی مگر کنارا بہت اونچا اور ڈھلوان تھا۔ دیوار کی طرح بنا تھا وہ ہر بار ناکام ہو کر لہروں سے لڑتی کبھی ہیڈ کی طرف کے بڑے دہانے کی طرف جاتی لیکن وہاں پانی کے زور اور موجوں کے شور سے گھبرا کر لوٹ آتی۔ اور پھر اپنی جدوجہد میں لگ جاتی۔ یہ بھینس ضرور کسی قافلے سے بچھڑ گئی ہو گی لیکن اب وہ موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اچانک تاجور سامری چونک اٹھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے کوئی بھاری چیز پل پر سے دریا میں پھینکی ہو۔ اس نے دریا پر جھانکا تو ایک چارپائی اور کپڑوں کی گٹھری لہروں میں گھومتی نظر آئی۔ اور آگے چلنے والے ٹولے میں رونے دھونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک شخص دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ ان کا لڑکا بیمار تھا رستے میں مر گیا۔ اب یہاں پھینکنے کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ دوسرا افسوس کے لہجے میں بولا اب بے گت مرا بچارا،

نہ دیا نہ بتی، ایک سردار جی اپنے ساتھی سے رازدارانہ لہجے میں بولے، سنتے ہو! کہتے ہیں یہ لاش بتی، میں کہتا ہوں۔ یہ اسلحہ تھا۔ جو انہوں نے ڈر کر پھینکدیا۔ بھلا اب کاہے کا ڈر تھا۔ بزدل کہیں کے ——— دوسرے نے دریا میں جھانک کر تائید میں سر ہلا دیا اور چل پڑے پل پار کر کے تاجور سامری ایک طرف سائیکل کے سہارے کھڑا ہو گیا پاس ہی ایک پرانے بڑ کے سائے میں گورکھا رجمنٹ کے ٹرک نظر آئے اور سڑک پر ہر بیس قدم کے فاصلے پر گورکھا جوان رائفل لئے ڈٹے تھے۔ پل کے پاس بھی ایک حوالدار اور دو سپاہی کھڑے تھے، پیدل تقریباً سبھی دریا پار کر آئے اور اب سڑک پر بھیڑ ہو گئی تھی۔ گڑھوال رجمنٹ کی ڈیوٹی ختم ہو چکی تھی اور اب یہ قافلہ گورکھا فوج کے سپرد تھا۔ گورکھا صوبیدار نے پکار کر کہا۔ شاباش بہادرو! اب ہندوستان دُور نہیں کافی سفر طے ہو گیا ہے۔ بس چند دن کی بات ہے پھر سب مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔ ہاں تو اب چلو اسی سڑک پر۔ ہمارے جوان آگے پہنچے ہوئے ہیں۔ یہ سنکر لوگ ایک سرخوشی اور امنگ میں لہکتے ہوئے چل پڑے ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل پڑی۔ اٹھتے ہوئے سورج کی تیز اور چبھتی ہوئی کرنیں اب خوشگوار ہو گئی تھیں۔ آسمان پھیکا نیلگوں تھا۔ ناہموار ہریالی سی لدی زمین۔ سنہری روشنی سی جگمگا رہی تھی۔ سرکنڈوں اور جنگلی جھاڑیوں نے پگ، مگر پتلی سی سڑک کو دونوں طرف سے پردہ دار بنا رکھا تھا۔ کہیں کہیں ڈھلوانوں پر ٹھہرا ہوا کائی والا پانی نظر آتا۔ ہزاروں انسانوں اور مویشیوں اور چھکڑوں اور ٹھیلوں کا میلوں لمبا شور اور ہیڈ کا گرجدار مسلسل دبدبہ ایک رعب اور دبدبے کا عالم پیدا کئے تھا۔ تاجور سامری سب سے آگے دُور تک پھیلی ہوئی بھاری گاڑیوں کے کچلنے سے زخمی سڑک پر سائیکل دوڑاتا جا رہا تھا۔ اچانک کسی نے اُسے پکارا۔ وہ فوراً رک گیا اور پلٹ کر دیکھا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر کے سردار صاحب تھے۔ وہ پاس آکر بولے۔ اس طرح بے سوچے سمجھے بڑھے جانا عقلمندی کا کام نہیں جانتے ہو دشمن کا ملک ہے۔ قدم قدم خطروں اور مصیبتوں سے بھرپور ہے۔ ذرا

دیکھ بھال کر چلنا چاہیئے۔ تمہیں کیا معلوم اس علاقے کے مسلمانوں نے راستے میں کہیں بم دبا رکھے ہوں!

تاجور سامری پر اُس شخص کی یہ فہمایش کارگر ہوگی اور وہ اب سب کے ساتھ ملکر چلنے لگا۔ اب دریا کئی میل دُور رہ گیا تھا۔ اور تنگ سڑک دھیرے دھیرے پھیلکر خاصی کشادہ ہوگئی تھی۔ بائیں طرف ایک گاؤں نظر آرہا تھا مگر زندگی کے آثار نا پید تھے۔ مکان سبھی سالم تھے لیکن حرکت نہیں تھی۔ کوئی انسانی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس سے یہ گھنے درختوں کے سائے کا یہ خوبصورت گاؤں ایک بھیانک قبرستان کی طرح دکھائی دینے لگا۔ اس کے بارے میں سب قیاس دوڑانے لگے۔ ایک سردار جی بولے، یہ سکھوں کا گاؤں معلوم ہوتا ہے۔ بلوچ فوج نے مار پیٹ کر اس کے بسنے والوں کو نکال دیا ہوگا۔ ایک لالہ جی کہنے لگے، یہ بھی تو ہوسکتا ہے یہ گاؤں مسلمانوں کا ہو۔ اور قافلوں کی آمد رفت کے کارن خالی ہوگیا ہو۔

تاجور سامری ان سب کی خاموشی سے سُن رہا تھا اچانک اس کا ساتھی ادھیڑ عمر کا سردار جی چلّایا ——— آگے نہ جاؤ سامنے خطرہ ہے ——— یہ سن کر سب پیدل رُک گئے۔ اور لگے پیچھے والوں کو روکنے! تاجور سامری نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا! خطرہ کہاں ہے! کسی طرف کوئی بھی نہیں؟۔

سردار جی بولے کسی طرف کیا۔ وہ سامنے دیکھو کیا ہے۔ تاجور سامری نے ذرا آگے بڑھ کر اور آنکھوں پر زور دیکر دیکھا، اسے ایک قطار میں چند مٹی کی ڈھیریاں دکھائی دیں۔ وہ بولا، یہ تو مٹی کی ڈھیریاں ہیں؟

سردار جی نے اُسے پیچھے کو کھینچ کر کہا۔ یہی تو خطرہ ہے میرے بھائی۔ ٹھیرو آگے کہاں جاتے ہو؟۔ ضرور تم دبائے گئے ہیں۔ اتنک اور بہت سے لوگ بھی آئے تھے، سب ان خاک کے تودوں میں بے خطروں کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مگر آگے کوئی نہ بڑھتا تھا، اچانک ایک گورکھا پیچھے سے چلاتا ہوا آیا۔ رکنا نہیں! رکنا نہیں۔ چلنا ——— چلنا ——— اور پاس آکر کڑک کر بولا، سب کیوں رک گئے! ——— چلو ———

سردارجی نے ڈرتے ہوئے کہا۔ وہ سامنے بم دبے ہیں ساتھی جی! گورکھا چلا کر بولا۔ ڈرپوک لوگ بہانہ کرتا ہی، کہاں ہے بم۔ ابھی ہمارا سفر مینا ادھر سے گزرا ہے ——— یہ کہہ کر اس نے جلدی سے جا کر ان ڈھیروں کو اپنے بھاری فوجی بوٹوں سے بکھیر دیا اور رائفل کے کندے سے کھود کر صاف ایک سڑک نکالدی ——— اور کہا، ڈرپوک! سب بہانہ آرام کرنیکا مطلب ——— چلو، سردارجی کھسیانے سے ہو کر پیچھے کے ٹولے میں گھس گئے۔ اب اس گورکھا کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ ایک بڑے سے ٹیلے پر جو سڑک کے کنارے پر تھا۔ ایک گورکھا صوبیدار ایک حوالدار اور تین سپاہی کھڑے تھے، صوبیدار نے پکار کر کہا تھکنا نہیں بہادرو ——— بڑھے چلو۔ دو میل چلکر آرام کریں گے۔ حوالدار چلایا، شاباش، شاباش! ہندوستان اب دور نہیں صرف دو دن اور چلو، چلو یہ کہہ وہ سب ان کے آگے آگے پیدل چل پڑے۔ اور ابھی فرلانگ بھی نہ چلے ہونگے کہ پچھلی طرف سے ایک بڑا فوجی ٹرک آ کر رک گیا۔ اور وہ سب فوجی اس میں سوار ہو گئے اور ٹرک آگے چل دیا۔

لوگوں میں اب پھر ایک بیدلی اور بے اعتمادی سی پیدا ہو گئی۔ ٹرک کے بائیں طرف کے سنگ میل پر تاجور سامری نے نظر ڈالی اس پر موٹے، کالے انگریزی حروف میں لکھا نظر آیا۔ بھائی پھیرو دو میل، سردارجی نے پکار کر کہا، پنڈت جی ——— یہاں سے بھائی پھیرو دو میل سے زیادہ نہیں۔ کیا لکھا ہی پتھر پر؟ ——— تاجور سامری نے جوابدیا۔ دو میل ——— سردارجی کی آنکھیں فخر سے چمکنے لگیں، اور وہ راز دارانہ انداز میں کہنے لگے، آج شب بھائی پھیرو ہی ہمارا پڑاؤ رہے گا۔

یہ خبر جلدی ہی پیچھے دور تک پھیل گئی اور لوگوں میں پھر سے بھروسا پیدا ہو گیا اچانک یہ خوشگوار احساس ایک دہشتناک نظارے نے کچل کر رکھ دیا۔ سامنے سے پوری گارد مسلح پاکستانی پولیس کی آ رہی تھی۔ ان کے چہروں پر نفرت اور زہریلی مسکراہٹ

نظر آ رہی تھی۔ پیدلوں کے جتھے کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ خوف کے مارے پیروں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔ سب وہیں جم کر رہ گئے۔ کوئی محافظ سپاہی بھی نہ تھا اور وہ تیزی سے آگے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ ان کے چہروں سے اندرونی کیفیت کی تصویر زیادہ نمایاں ہو رہی تھی اچانک پہلو کے ایک ٹیلے کی طرف ہو کر ایک سپاہی نے رائفل کندھے سے الگ کی۔ اب تو سب کے چہرے فق ہو گئے۔ کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ اچانک آن سپاہیوں میں ہلچل مچ گئی جو بہت جلد جلد بھگدڑ میں بدل گئی۔ ایک پاگل اونٹ ان کے پیچھے بلبلاتا ہوا بھاگا ——— اور اس کے ساتھ ہی ایک قہقہہ فضا میں گونجا ——— جب نے دیکھا تو اس ٹیلے پر تین گودڑ سپاہی سنگینیں اٹھائے اُن بھاگتے ہوئے سپاہیوں پر ہنس رہے تھے۔ اب سب کی جان میں جان آئی اور پھر سب ہنسنے لگے۔ اس واقعہ کا اثر دیکھتے دیکھتے دوسروں کی صورت میں آخر تک پہنچا۔ اس سے فضا میں ہزاروں قہقہے اور چیخیں گونجنے لگیں۔

قافلہ بھائی پھیرو کے پاس سے گزر رہا تھا۔ بائیں طرف پولیس چوکی تھی۔ پولیس کے جوان ایک طرف دنیا سے کٹے ہوئے لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ بھائی پھیرو کا قصبہ ایک تاریخی حیثیت کا گاؤں تھا۔ مگر اب وہاں بربادی اور بے رونقی کی حکومت تھی مندر اور گوردوارے کے کلس معزول اور مغلوب سرداروں کی طرح اپنی اونچی ہوتی چوٹیاں لیے اداس کھڑے تھے۔ بیشمار مکان ٹوٹے پھوٹے اور گرے پڑے دکھائی دیتے تھے۔ کہیں کہیں دھواں بھی اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ غالباً مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے مسلمان یہاں آ بسے ہوں گے۔

ایک بڑے احاطے میں ایک اور قافلہ ڈیرہ ڈالے تھا۔ احاطے والے لوگ باہر آ گئے اور راستے میں بیٹھے ہوئے مردوں اور عورتوں سے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کی خیریت پوچھنے لگے۔ ایک گوردوارہ جو اب مسجد بنا دیا گیا تھا۔ اس کا کنواں چل رہا تھا۔

کچھ مقامی لوگ پانی بھر رہے تھے کچھ نہا رہے تھے۔ قافلے کی آمد سے سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ بیل اپنی دھن میں چلتے رہے۔ اور پیاسوں نے اپنی پیاس بجھانی شروع کی اتنے میں دو گورکھا سپاہی آئے اور لوگوں کو آگے چلنے کا حکم دیا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ پڑاؤ یہاں سے میل بھر آگے چل کر ہوگا ——— چنانچہ پھر سب چل پڑے اب پیچھے کو دیکھنے سے دور تک قافلے کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ تاجور سامری ایک نظر پیچھے کی طرف ڈال کر چل پڑا ——— ملک کندن لال اور نند کشور بھی اس سے آملے۔ اور تھوڑی دیر میں ایک کھلے میدان میں ڈیرے ڈالے گئے۔ یہ جگہ کوڑا کرکٹ گوبر اور گھاس پھوس سے پٹی پڑی تھی۔ لوگوں نے تھوڑی ہی دیر میں رات بھر ٹھیرنے کے قابل بنا لی ——— تاجور سامری اور ملک کندن لال نے ملکر سڑک کے قریب ہی جگہ صاف کی اور سائیکلوں کو دو لاٹھیوں سے باندھ کر اوپر موٹا کمبل اور چادر ڈال کر اچھا خاصا تمبو بنا لیا۔ صاف کی گئی جگہ پر چٹائی اور ٹاٹ بچھا کر تاجور سامری لیٹ گیا۔ ملک صاحب نے اپنی بالٹی سے دو گلاس پانی کے بھرے اور ایک پوٹلی کھول کر بھنے چنے اور گڑ کے تلے ہوئے گلگلے نکالے اور تاجور سامری کو ساتھ شامل کر کے کھانا شروع کیا۔ تاجور سامری کو اس کھانے میں بہت مزا آیا۔ نند کشور کہیں دور گھومنے جا چکا تھا ——— یہ دونوں کھا پی کر لیٹ گئے۔ اور جلدی ہی انہیں خوشگوار نیند نے اپنے قبضے میں لے لیا۔

تاجور سامری اٹھا تو اپنے بدن میں چستی اور طبیعت میں خوشگوار ہلکا پن محسوس کیا ملک کندن لال نے اُسے ہوش میں پا کر کہا میں ذرا گھوم پھر آؤں تم بیٹھو یہاں بہت سو چکے ہو، یہ کہتے ہوئے تاجور کے جواب کا انتظار کئے بغیر خیمے سے باہر نکل گیا۔ تاجور سامری نے اونچے گلے سے کہا ملک صاحب جلدی لوٹئے گا مجھے بھی رفع حاجت کو جانا ہے۔ ملک صاحب دور ہی سے ہاں میں سر ہلا کر ایک خیمے کے پیچھے غائب ہو گئے۔ تاجور سامری خیمے سے نکلکر اپنے ڈیرے کے باہر ٹہلنے لگا۔ ساڑھے پانچ بج رہے تھے مگر دھوپ ابھی خاصی تیز تھی لمبا چوڑا میدان جو پہلے کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ ایک عجیب قسم کی چہل پہل کی آماجگاہ بنا ہوا

گردش کو تیز کر دیتے۔ سردار جی ان کی پریشانی دیکھ کر ذرا سنجیدگی اختیار کر کے کہنے لگے۔ قبلہ آپ کو ہاضمے کی شکایت جان پڑتی ہے۔ چورن کا استعمال فرمایئے گا۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے کوٹ کی جیب سے لون بھاسکر کی شیشی نکال لی۔ مولوی صاحب جھلا کر اپنے میں گھس گئے۔ اور ادھر خوب قہقہے لگے کہ سارا ڈبہ قہقہہ زار بن گیا۔ سب لوگ اب شغل میں شریک تھے

اب پھر سنجیدگی سے بات شروع ہوئی ایک بابو نے یوں زبان ہلائی۔ کیوں صاحب اب خضر حیات خاں صاحب کے استعفیٰ کے بعد کون وزیر اعظم ہو سکتا ہے؟

تاجور سامری نے جواب دیا۔ مسلم لیگ کے سوا کون اس میدان میں ٹھہر سکے گا۔

خانصاحب تو کیا کانگریس اور اکالی پارٹی ساتھ نہیں دیں گی؟

تاجور سامری نے کہا آپ بھی کیسی بھولی باتیں کرتے ہیں۔ مہربان اگر یہ دونوں با اثر جماعتیں ساتھ دیتیں تو خضر صاحب کو وزارت سے الگ ہی کیوں ہونا پڑا۔ ان دونوں کی خود غرضی اور بے وفائی سے پنجاب کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ممکن ہے گورنر اختیارات خود سنبھالے لیکن حالات کا سنبھلنا مشکل نظر آتا ہے۔

یہ سُنکر خاں صاحب غمگین ہو گئے۔ شیخ جی اور سردار جی بھی افسردہ تھے۔ اور دوسرے مسافر بھی اب پہلے کی طرح مطمئن نظر نہیں آتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سب کو کسی آنے والے خطرے کا پتہ چل گیا ہے۔ اور جیسے سب کی رد میں وقت سے پہلے ہی سلب ہو چکی ہوں

شیخ صاحب جوش میں آکر پھر کہنے لگے ——— یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہم پنجاب کے رہنے والے اپنے امن اور اتفاق کو قائم رکھنے کی کوشش کرینگے ہم ہندو مسلمان جن کا کچھ بھی الگ نہیں۔ کوئی شے بٹی ہوئی نہیں اپنے صدیوں کے تعلقات کو نہیں توڑ سکتے۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اس خونی کھیل کے ذمہ دار گنڈے ہو سکتے ہیں

تھا۔ بہت سے ڈیرے مکمل ہو چکے تھے اور بہت سی تیار ہو رہی تھے جو لوگ دیر سے پہنچے وہ جگہ نہ ملنے کے کارن جھلائے اور غصیلے انداز میں اپنے سے پہلے آئے لوگوں سے جگہ کا تقاضا کرنے لگے، چولہے بھی گرم ہو چکے تھے۔ اور ہلکا ہلکا دھواں اس بے درو دیوار کی بستی پر چھا رہا تھا۔ مویشی بھی آدمیوں ہی میں گھسے نظر آتے تھے، پڑوس کی ایک ادھیڑ عورت جس کی صورت کریہہ اور رنگ گہرا چمکیلا کالا تھا اپنے بوڑھے خاوند سے چہلیں کر رہی تھی۔ اور اس کی بھینس تاجور سامری کے ڈیرے سے پیٹھ بھڑائے اپنے چارہ سے گردن اٹھائے سڑک پر کی رونق کو دیکھ رہی تھی اچانک اس نے ہگ دیا اور گوبر سفید قمیص پر نقش و نگار بناتا ہوا ملک کندن لال کے ٹرنک پر آکر جم گیا۔ تاجور سامری نے غصّے کو دباتے ہوئے پکار کر کہا۔ سردارجی اپنی بھینس کو یہاں سے ہٹا لو۔ یا دوسری طرف باندھ لو۔ دیکھو ہمارے کپڑے خراب کر دیئے ہیں گوبر کر کے مگر معلوم ہوتا تھا وہ بوڑھے سردارجی اپنی پری چہرہ عورت کی محبت امیں اس قدر غرق تھے کہ انہوں نے ادھر آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ عورت البتہ ایک معشوقانہ انداز سے اپنے سنہرے دانت کی نمائش کرتی ہوئی بولی۔ تے کی ہو گیا۔ بھراجی! جے مجھ نے پھوس کر دتا اے نے دچاری کیہڑی عقل رکھدی اے، (بھائی صاحب کیا ہوا جو بھینس نے گوبر کر دیا وہ بچاری عقل تھوڑی رکھتی ہی) تاجور سامری نے اس سے بھڑک کر کہا مائی! بھینس کے عقل نہیں آپ کے بھیجے میں تو ہے۔ میں آپ ہی سے کہہ رہا ہوں .... وہ عورت مائی کا لفظ سنکر طیش میں آکر بولی۔ نیری مت ماری گئی اے بھرا۔ میں تیری مائی لگدی آں؟ میں کوئی بڈھی آں ہیں اُڈھ بڑھ جانا! مینوں مائی کہندا اے سُندے او سردارجی (بھائی تری عقل تو نہیں ماری گئی میں تیری ماں تو نہیں ہوتی۔ میں کوئی بوڑھی ہوں! سردارجی سن لو یہ غرق ہو جانے کے لائق مجھے مائی کہتا ہی)۔ اب سردارجی کا نشہ بھی لوٹا اور وہ گرجکر بولے۔ اوئے سرگھسیا! کی بکدا ایں؟ دھرتی چہ دھک دوں! سالیا کی کہندا ایں مائی! بھیڑ خال ہیں تینوں وساں کس طرح کہی دال لے اینج۔ (او

سر گھسے کیا کہہ رہا ہو زمین میں گاڑ دوں گا تائی کہتا ہی ٹھہر تو مجھی میں تجھے بتاتا ہوں کہ کس طرح کہا جاتا ہی مائی)

تاجور ساحری نے بھی اب ذرا تیزی اختیار کی۔ اور بولا۔ تم لوگ معلوم ہوتا ہی سفر کی تکان سے تنگ آکر جھلائے بیٹھے ہو، ورنہ بات کوئی نہ تھی۔ آپ کی عورت کو تو خواہ مخواہ کی غلط فہمی ہی۔ اتنے میں ملک صاحب آگئے اور اپنے ٹرنک کا حلیہ دیکھ کر آگ بگولا ہوگئے اور آکر لڑائی تیز کر دی، انہوں نے جوش میں آکر بہت کچھ بکا جھکا۔ آخر لوگوں کے بیچ بچاؤ کرنے سے وہ سردار جی اپنی بھینس کو دوسری طرف باندھنے پر رضا مند ہوگئے۔ مگر وہ عورت اپنی خوب صورتی اور عورت پن کی تذلیل سی کباب ہو رہی تھی اور تاجور ساحری پر شعلے برسا رہی تھی۔ وہ ملک صاحب کو کیمپ میں چھوڑ کر رفع حاجت کو چلا گیا۔

دن ڈھل چکا تھا۔ سورج ڈوبنے پر بھی روشنی مٹی نہیں تھی۔ شفق اور اندھیرے کا ملاپ ایک سہانا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ اور دھواں اب گاڑھا ہو کر فضا میں آسمان کو دھرا کر رہا تھا اور دور تک چٹیل زمین اب سہاونی نظر آتی تھی وہ دھیرے دھیرے چلتا ادھر آیا۔ جہاں قافلے کے محافظ فوجی گورکھوں کا ڈیرہ تھا۔ چار آدمی سر جھکائے ایک طرف کھڑے تھے ڈگور کھے انکے دونوں طرف کھڑے تھے اچانک خیمے سے ان کا افسر باہر آیا سپاہیوں نے فوجی سلام کیا۔ افسر نے پوچھا ان کو کیوں لائے؟ ایک گورکھا بولا، بدمعاش جوا کھیلتا۔ شراب پیتا۔ اور پھر اپنے ساتھی کو مارتا۔ پرائی عورت کو چھیڑتا۔ افسر کا غصہ بات کے ختم ہونے تک بھڑک چکا تھا۔ اس نے ایک کے بوٹ کی ٹھوکر مار کر پوچھا! کیوں جوا کھیلتا! سالا! شراب پیتا —— کہاں سے لی شراب! وہ سب خاموش .... افسر نے دوبارہ بھی سوال کیا! اب ایک شخص نے جواب دیا۔ حضور! ان لوگوں نے نیچے کی سے خریدی تھی۔ تاجور ساحری کا ذہن یہ سن کر نیچے کی سے گذرتے ہوئے ان چار آدمیوں کی طرف چلا گیا۔ جو دکاندار کو جھانسہ دیکر شراب لے آئے تھے۔ اس نے غور سے انہیں دیکھا۔ واقعی وہ چاروں وہی تھے۔

اور یہ بکنے والا وہ چوتھا ایک کھڑا رہنے والا ——— فوجی افسر نے غضبناک ہو کر ان کو ہنٹروں سے پیٹنا شروع کیا، اور وہ چاروں زور زور سے شور مچانے لگے۔ چیخنے لگے، معافی مانگنے لگے اور افسر کہتا، تم سالا، بے ایمان، راشن مفت لیکر بیچتا اور شراب خرید کر پیتا، بے ایمان! مصیبت میں بھی شراب پیتا، اور ساتھی کو مارتا، سالہ دوسرے کی عورت کو کیوں چھیڑتا۔ بدمعاش یہ کہکر اس نے پورے زور سے ان کو بے تحاشا پیٹنا شروع کیا۔ جب وہ تھک گیا۔ تو اس نے اپنے ماتحتوں کو اس کام پر لگا دیا۔ تاجور سامری سے دیر تک یہ نظارہ دیکھا نہ گیا اور اپنے ڈیرے کو چل پڑا راستے میں اسے نند کشور ملا؛ اور کہنے لگا؛ منّدا اور اس کی بیوی آگئی ہی ہیں، ان کے ساتھ رہوں گا تمہارے ڈیرے کے پاس ہی ہوں میرے گھر والے آئیں تو بتا دینا میری جگہ۔ یہ کہہ وہ تیزی سے ایک جھاڑی کے پیچھے چلا گیا۔

تاجور سامری ڈیرے سے ہو کر سڑک پر آیا۔ دونوں کنارے چھکڑوں اور مویشیوں سے پٹے پڑے تھے، کہیں کہیں لیمپ اور گیس کی روشنی ہو گئی تھی۔ ڈیروں میں بھی چراغوں اور لیمپوں اور ٹبیوں سے روشنی نظر آتی تھی۔ سڑک پر چل چلاؤ کا عالم تھا۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا، لوگ اپنے دوستوں رشتہ داروں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ پکاریں اور آوازیں اب شدت اور کثرت اختیار کرتی جا رہی تھیں کہیں سے کوئی گونجتا ——— ماما۔ ماما۔ ماما ——— اور کہیں سے پکار سنائی دیتی۔ چاچا ——— او ——— اوئے اکثر جھنگ ضلع کی زنانہ آوازیں ہر طرف سے ہی محسوس ہوتیں۔ شیلا جیوڑا ——— رام دئی گگرا ——— لال وتی تمنجہ ——— اور پھر آواز گونجتی ——— ماما۔ ماما ——— ماما ——— ماما ——— او

تاجور سامری بھی اپنے بھائی کا نام لیکر پکارتا تھا۔ پرکاش کوی ——— پرکاش کوی ——— اور کبھی اپنے باپ کو بھائیا ——— اور کبھی نند کشور کے باپ کو۔ رام لال ——— اس کے جواب میں کسی نے تاجور سامری کو پکارا، اب آوازیں دونوں

طرف سے قریب آنے لگیں یہاں تک کہ رام لال تاجور سامری کے پاس آگیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے لڑکے کے متعلق پوچھا، تاجور سامری نے کہا وہ میرے ڈیرے کے پاس ہی ہے۔ میرے ماں باپ بھائی کہاں ہیں! رام لال نے بے صبری سے اُسے کھینچتے ہوئے جواب دیا۔ میں تمہیں ان کے پاس لے چلوں گا۔ پہلے نند کشور کے پاس مجھے لیچلو۔ تاجور سامری مجبور ہو کر ڈیرے کو پھرا لیکن رستے ہی میں نند کشور انہیں مل گیا۔ اب تینوں پھر پلٹے اور تھوڑی سی کش مکش کے بعد آخر ان کو وہ جگہ مل گئی جہاں تاجور سامری کے ماں باپ بھائی اور رام لبھایا اور اس کا کنبہ بیٹھا تھا سڑک کے کنارے ایک خشک نالے کی ریت پر چادر بچھائے کوی پرکاش نڈھال حالت میں پڑا تھا۔ تاجور سامری کے ماں باپ اور بھانجی بھتیجی اس کے پاس بیٹھے سڑک پر ہر آنے جانے کو جستجو کی نظروں سے دیکھ رہے تھے رام بھایا کی بیوی اپنے چھوٹے بچے کو دودھ پلا رہی تھی اور رام لبھایا اپنے بڑے دو لڑکوں کے ساتھ سوکھی روٹی کھا رہا تھا۔ شاہنی اور اس کی لڑکی اور لڑکے ایک طرف بیٹھے رام لال کا انتظار کر رہے تھے۔ ان تینوں کے آنے سے سب خوش ہو گئے۔ کوی پرکاش بھی اُٹھ بیٹھا۔ کرپا رام لاغر نے تاجور سامری سے خیریت پوچھی۔ تاجور سامری نے جواب دیا۔ یہاں سے اٹھو۔ ڈیرے پر چلکر باتیں ہوں گی! اس کی ماں بولی۔ میری جان میں جان تو اب آئی ہے۔ سچ جانو دو دن میں نے اَن پانی نہیں لیا۔ پیچش اور تھکاوٹ نے الگ کمر توڑ دی ہے۔ اس تمہاری جدائی اس طرح! الگ نہ ہو جایا کرو۔ وقت کا بھروسہ نہیں یہ کہہ کر اس نے راشن کا بقچہ اٹھایا اس کے ساتھ ہی دوسرے بھی اُٹھے اور اپنے ڈیرے پر آگئے۔ ملک صاحب اس ڈیرے سے تاجور سامری سے لڑنے کو آمادہ تھے۔ لیکن اس بھیڑ کو دیکھ کر چکیے ہو رہے۔ وہ بھینس والے سردار جی وہاں سے ڈیرا اٹھا چکے تھے۔ اب جگہ خالی تھی۔ تھوڑی دیر میں جھاڑ بُہار کر جگہ صاف کر کے ڈیرا لگایا گیا۔ کوی پرکاش اور تاجور سامری اس کمیسوں کے بنے ہوئے خیمے میں پڑ گئے۔ تاکہ اوس اور سردی سے بچے رہیں۔ جب کھانا تیار ہوا۔ کھا

پی کر وہیں لیٹ گئے۔ اور باتیں چھڑ گئیں۔

شاہنی نے پوچھا! ابھی کتنے دن اور چلنا ہوگا۔ نند کشور کے تپا! میرے پاؤں بھی دکھنے لگے ہیں۔ رام لال نے بڑے مدبرانہ انداز میں جواب دیا۔ بے صبر کیوں ہوئی جاتی ہو۔ شاہنی! بس اب ہندوستان زیادہ دُور نہیں ——— میرا خیال ہے ہم کل کھانا کھیم کرن پہنچکر تیار کر سکیں گے۔

رام لبھایا بولا۔ خواب کی باتیں کرتے ہو؟ ابھی تو دو پڑاؤ اور ہوں گے۔ کھیم کرن کسی طرح بھی یہاں سے پچاس میل سے کم نہ ہوگا ——— رام لال نے اسی انداز میں جواب دیا۔ تم کچھ نہیں جانتے رام لبھایا! مجھے ایک فوجی افسر سے پتا چلا ہے۔ کہ کھیم کرن سے ٹرک ہمارے لئے آئیں گے۔ ہو سکتا ہے رستے میں ہی مل جائیں ہمیں بس گھنٹہ بھر کی بات ہے۔ بولو۔ کھانا تیار رہوانہ کھیم کرن میں؟

رام لبھایا جھلا کر بولا۔ جس فوجی افسر نے تمہیں یہ بتایا ہے اسی نے مجھے بتایا ہے کہ ٹرک کھیم کرن سے امرت سر کے لئے ملیں گے۔

اس پر رام لال ناراض ہو گیا۔ اور منہ بنا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ رام لبھایا بھی چپکا ہو رہا تھا۔ تاجور سامری کی ماں بولی۔ تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ دونوں بھائی بس لڑتے ہی رہتے ہو؟ اس مصیبت اور پردیس کا تو کچھ خیال کرو۔ یہاں تمہیں اچھی اچھی باتیں کرنی چاہئیں۔ جھگڑے فساد کی نہیں۔

اس کی فہمائش پر ایک خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد شاہنی نے بات رُخ بدلنے کی کوشش میں یوں لب کھولے۔ پر کاش کی ماں! کچھ پتا ہمارے چھکڑے کا بھی چلا؟ ہمارا تو سب کچھ اس پر ہے ——— اس تذکرے سے اچانک پھر میل ملاپ کی فضا بنگئی۔ رام لبھایا کی بیوی بولی، میرا تو سارا ریشم اور کمخواب کا جہیز سامان وہاں ہے۔ بھائیا! اس چھکڑے کا کچھ پتا نہیں کیا۔ تم ملے بھی تھے۔ تم نے کہا تھا؟

کرپارام لاغر بولا، ہاں مانا تھا۔ اس مجبور کے ساتھ وہ جیونا بھگت تھا مجھے کہنے لگا۔ وہ مجبور کہ اگر سامان کی حفاظت چاہتے ہو تو ساتھ رہو بھیلے کے۔ نہ جانے کب کوئی حادثہ پیش ہو جائے۔ گڈا ٹوٹ جائے یا بھینس ہی مر جائے ــــــــ میں نے کہا، بھائی یہ بیوپار کی بات نہیں لائلپور سے کھیم کرن کا کرایہ دیا ہی۔ ٹھیلہ خریدنے میں حصہ بھی برابر لگا دیا ہی۔ اب سامان کی حفاظت کے ذمہ دار تم ہو میں نہیں ــــــــ اس پر وہ جیونا بھگت بھی بھڑکا۔ اور کہنے لگا۔ کہ آپ اس حال میں ہم سے سامان کا مطالبہ نہیں کر سکتے ــــــــ میں نے اسی تیزی سے جواب دیا۔ ضرور کر سکتا ہوں۔ کھیم کرن پہنچ کر دیکھنا کیونکر لیتا ہوں سامان تم سے۔

تاجور ساہری کی ماں نے گھبرا کر پوچھا پھر کیا کہا اس نے مجھے وہ کوئی اچھا آدمی نظر نہیں آتا۔

کرپارام لاغر نے بے پروائی سے جواب دیا کہنا کیا تھا بکتا رہا۔ ابھی باتیں لینا سالا تمہیں دیں گے سامان۔

رام لبھایا ایک مخدوش مستقبل کا احساس کرتے ہوئے بولا۔ تم نے غلطی کی لاغر صاحب اس شخص سے پیار سے کام لینا تھا۔ اب سامان کی خیر نہیں۔

کرپارام لاغر نے پھر لاپروائی اور اکڑ سے جواب دیا۔ واہ! سامان کی خیر نہیں کیوں خیر نہیں؟ ــــــــ ایسے ایسے بدمعاش تو میں نے اپنی ملازمت کے دوران میں تیر کی طرح سیدھے کر دیئے ہیں۔ یہ کس شمار میں ہی۔ ذرا پہنچ تو لینے دو۔ کھیم کرن۔

تاجور ساہری بولا۔ بھائیا تم غلطی کرتے ہو۔ اور اس پر تم رنگ غلطیاں کرتے رہتے ہو۔ رام لبھایا ٹھیک کہتا ہی، تم نے جیونا بھگت سے جھگڑا کر کے اچھا نہیں کیا۔ وہ سامان کو ضرور خرد برد کرے گا۔

کرپارام لاغر بھڑک کر بولا۔ رہنے دے یار۔ مجھے بیوقوف ہی سمجھ رکھا ہی، میری

باتوں میں ٹانگ نہ اڑایا کرو۔

تاجور سامری بولا، مجھے اس وقت دخل درمعقولات کرنا پڑے گا۔ جب تمہارا کوئی قدم دوسروں کے لئے نقصان دہ ہو۔ —— اس پر کرپا رام لاغر اسے گالیاں دینے لگا۔
تاجور سامری کی ماں بیچ میں بول اٹھی ہیں تو ان دونوں بھائیوں کو کہتی تھی یہاں باپ بیٹے میں چل نکلی، میں کہتی ہوں پرکاش کے بھائیا تم ہی کچھ سوچو، غلطی کر کے پھر جھگڑتے ہو، یہ کیا انصاف ہے —— کرپا رام لاغر غصہ اپنے خلاف دیکھ کر کہنے لگا تم یوں کیوں نہیں کہتے ہم سے الگ ہو جاؤ۔ یہ کہہ کر وہ ان ماں بیٹے سے ذرا دور جا کر لیٹ کر دھیرے دھیرے بڑبڑانے لگا —— شاہنی نے پھر بات کا رخ بدلا، بولی میں تو بلو ہیڈ پر ہی تھک کر نڈھال ہو چکی تھی لیکن جب میں نے دریا کی لہروں میں ایک بھینس کو زندگی کے لئے لڑتے دیکھا تو میری ہمت بندھ گئی۔

تاجور سامری نے چونک کر پوچھا: تو وہ بھینس جیتی تھی تمہارے پہنچنے تک؟
شاہنی بولی۔ ہاں، اگر تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔
کوی پرکاش بولا۔ ڈوب گئی ہو گی بچاری اب تو، اس بات نے ساری بات چیت کا رنگ بدل کر خاموشی کا عالم طاری کر دیا۔

اب تاجور سامری چپکا کانوں اور دھیان کے ذریعے ساری بستی کی سیر کرنے لگا۔ کہیں ڈھولک بج رہی تھی اور دیوی کے بھجن گائے جا رہے تھے کہیں خوش گپیاں اور قہقہے سنائی دیتے تھے اور کہیں اندھیری جگہ پر کوئی اپنے ساتھی سے بچھڑا ہوا مایوسی اور تنہائی میں گھرا ہوا بیٹھا سسکیاں بھر رہا تھا —— محافظ فوجی لاریاں بستی کے چاروں طرف مستعدی سے گھوم پھر رہی تھیں۔ کان بند ہو گئے۔ اور خیال نے پھر پرواز لی۔ اور اڑ نکلا —— اس عارضی بستی سے ہٹ کر اپنی من چاہی دنیا کی سیر کرنے۔

اگلی صبح جب منہ اندھیرے قافلہ نے کوچ کر دیا تھا۔ تاجور سامری موت کے چنگل سے بال بال بچا۔ ہوا یہ کہ آج جب وہ اپنے ماں باپ اور دوسرے ساتھیوں سے ٹوٹ کر پیدلوں کے ساتھ جانے لگا تو اس کے چھوٹے بھائی کوی پرکاش نے ضد کی مجھے بھی ساتھ لیچلو، اس پر اس کے باپ اور ماں نے بھی زور دیا کہ آج اسے بھی ساتھ لے جاؤ۔ مجبوراً اسے ساتھ لیکر ناشتہ بائیکل سے باندھ چل پڑا۔ چاند کو بھیم میں گم ہوئے دو گھنٹے ہوئے تھے اور ابھی خاصہ اندھیرا تھا اسپر سڑک کے آس پاس درختوں کی کثرت اور آسمان پر بادل۔ دونوں مزے سے تیز تیز چلے جارہے تھے کہ بائیں طرف سے ایک ریوڑ بھینسوں کا بے تحاشا بھاگتا ہوا نکلا اور یہ سلسلہ بڑھتا ہی گیا، تاجور سامری اور کوی پرکاش دائیں طرف کو جھکے آگے ایک چھکڑا رکا ہوا تھا۔ وہ دونوں اس کی پشت سے لگ کر بھینسوں کی بھیڑ کے چھٹنے کا انتظار کرنے لگے۔ اچانک ایک اور چھکڑا پیچھے سے آ چڑھا اور گاڑیبان جبتک کہ باگ روکے بیل تاجور سامری کو رگیدنے لگ پڑے تھے۔ بھینسوں کی بھیڑ چھٹ گئی۔ کوی پرکاش کودکر ادھر ہو گیا۔ اور اپنے بھائی کو بازو سے کھینچکر باہر نکالا۔ سائیکل بھی سلامت نکل آئی لیکن تاجور سامری کی سولا ہیٹ اور ناشتہ کی پوٹلی چھکڑے کے بھاری پہیئے تلے آکر کچلی گئیں۔ جاٹ نے جب ان کو دونوں کو زندہ سلامت پایا تو برس ہی پڑا، آنکھوں میں موتیا بند اتر آیا تھا کہ ہوش چھوڑے گئے تھے؟ چلنا ہی نہیں آتا، کوی پرکاش گاڑیبان کی زیادتی اور ڈھٹائی پر جھلا کر بولا، عجیب انسان ہو اپنی غلطی ہم پر تھوپتے ہو! شرم آنی چاہیئے تمہیں۔ اس پر وہ جاٹ طیش میں آکر نیچے کود پڑا۔ لیکن اتفاق یہ ایک گروہ مویشیوں کا اور بیچ میں آپڑا جس سے وہ اپنی نہ کرسکا۔ اور تاجور سامری کوی پرکاش ساتھ لے کر چپکے سے بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

دس میل تک پتلی سڑک نے ساتھ دیا اس کے بعد اچانک فوجی رہبر نے رُخ بدلا، اور ایک بے گھاس کے بن میں گھسا۔ گیارہ سے اوپر ہی بجے ہوں گے! دھوپ کی تیزی

ریت اور زمین کی خشکی نے بڑھا دی ہو۔ پیدل جلدی ہی فرلانگ بھر دور بھاگ کر چکے تھے اور ایک جنگلی درخت کے ٹھنٹھ کے تلے سے سائے کے گرد منڈلا رہے تھے۔ اور پکی سڑک پر فرلانگوں تک قافلہ آتا دکھائی دیتا تھا۔ فضا پر غبار۔ دھندلاہٹ سے چھت سی پڑی معلوم ہوتی تھی، سوکھی ریت کی دلدل میں تانگے اور ٹھیلے بڑی مشکل سے چل رہے تھے۔ بعض ٹوٹ بھی گئے تھے، ان کا سامان فوجی افسر کی ہدایت پر ٹرکوں میں بھرا جا رہا تھا۔ لیکن کاروں ذرا نہیں تھا۔ لوگ چلے آ رہے تھے۔ ایک ختم نہ ہونیوالے سلسلے کی طرح ایک، ان گنت ٹانگوں والے بھاری اور مہیب اجگر کی طرح۔ جو کسی نہ معلوم جنگل کی طرف اپنی عجیب و غریب اور وسیع و عریض بانبی کی طرف جا رہا ہو۔

پیدلوں کے جتھے کے اگلے حصے میں تاجور سامری اور گوی پرکاش سائیکل لئے پیدل چل رہے تھے ان کے آگے ایک سردار صاحب پٹیالہ شاہی پگڑی اور نیم فوجی لباس پہنے۔ کندھے پر دونالی بندوق دائیں ہاتھ میں برچھا تھامے مونچھوں کو بل دیتے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ اپنی بہادری کے واقعات بھی کہتے جاتے وہ اپنے آپ کو نیشنز صوبیدار ظاہر کر رہے تھے۔ آس پاس کے مسافروں پر اس بات سے ان کا خاص رعب جم گیا تھا، ان سے چار آدمی بائیں طرف ایک شاہ جی پستول لگائے اور ہاتھ میں فوجی کرچ لئے اپنی گول گول آنکھوں کو تیزی سے گھما کر اور بے ڈول پیٹ کو ہلا ہلا کر کچھ کہہ رہے تھے۔ وضع قطع سے وہ جھنگ ضلع کے مسلمان معلوم ہوتے تھے، فوجی محافظ دو فرلانگ بھر پیچھے رہ گئے اچانک ایک طرف سے ڈھول کی آواز سنائی دی۔ ویرانے کی خاموش فضا میں یہ آواز بھیانک انداز سے گونجی، پیدل چلنے والے گھبرا کر رک گئے۔ ایک لالہ جی پکارے، کہاں بڑھے جاتے ہو، آپ اپنے دو فوجیوں کو کوئی مصیبت آیا چاہتی ہے۔ ایک لمبے قد کے بابو جی نے دور پر نگاہیں گاڑتے ہوئے خوف سے کانپتے ہوئے اعلان کیا! ساتھیو آثار برے نظر آتے ہیں۔ میرا خیال ہے پلٹ چلو، دونالی والے سردار جی گھبرا کر بولے، کیوں کیا بات ہے؛

...ARY

وہ پستول والا شاہ بھی چونکے! بات کیا ہی! ——— اتنے میں سب نے دیکھا دائیں طرف دو فرلانگ کی دُوری سے ایک گروہ گھڑ سواروں اور شتر سواروں کا ادھر بڑھ رہا ہی۔ سردار جی کے خوف کے مارے ہاتھ پیر پھول گئے انہوں نے بھیڑ میں چھپنے کی کوشش میں کندھے کی دونالی اور ہاتھ کا برچھا کہیں کھو دیا، پستول والے لالہ جی نے پستول کوٹ کے اندر چھپا لیا، اور لرزتے ہوئے کہنے لگے۔ اب کیا کیا جائے۔ ہم اگر پکاریں بھی تو ہمیں مدد اس وقت پہنچے گی جب ہم کٹ جائیں گے! یہ سود و سوسے اُدھر ہی آدمی معلوم ہوتے ہیں!

ایک لالہ جی بولے! سُنا ہی اس طرف کے جانگلی بڑے لڑاکے اور سنگدل ہوتے ہیں لوگوں میں ہراس اور بے اعتمادی پھیلنے لگی۔ سب کے چہرے فق نظر آتے تھے۔ اور ادھر وہ گروہ نزدیک آرہا تھا، یہاں تک کہ لوگوں نے واپس کھسکنا اور پھر بھاگنا شروع کیا۔ اچانک ایک کڑک نے سب کے قدم باندھ لیے۔ کہاں جاتا ہی! آگے جانا! پیچھے کیوں جاتا! گورکھا حوالدار حیرانی اور غصّے سے لوگوں کی اس بدحواسی اور رجعت کو دیکھ کر کہہ رہا تھا، اب دونالی والے سردار جی اپنے ہتھیاروں سے لیس ہو کر پھر سامنے آئے اور کہنے لگے، جناب وہ حملہ آور.....

گورکھا حوالدار پھر کڑکا! ڈرپوک! کہاں حملہ آور تمہارا دماغ خراب ہی۔

شاہ جی سمجھ کہنے کو تھے، کہ حوالدر کی نظر خود بخود ادھر گئی اب اس کے ذہن میں سب بات آگئی اور سنجیدگی سے بولا، گھبرانے کی کیا بات ہی! ہم ٹھیک کرتا ——— یہ کہہ اس نے اپنے ساتھ کے سپاہیوں کو تیاری کا آرڈر دیا۔ انہوں نے اپنی سٹین گنیں بھر لیں۔ دوسرے لمحے فائر کا آرڈر فضا میں گونجا۔ اور ساتھ ہی ٹھائیں ٹھائیں۔

بڑھتا ہوا گروہ حیرانی کے انداز میں رک گیا۔ پھر اس میں ہراس پھیل گیا۔ پہلے ہی وقت ان میں کئی گھوڑوں کی پیٹھ سے گھبراہٹ میں گرے بھی، ایک جاٹ کی گھوڑی لے کر وہ حوالدار ادھر دوڑا۔ لوگوں میں اب بھروسا اور اطمینان پیدا ہو گیا

انگریز اور اس کے پٹھو ہو سکتے ہیں۔ ہندو مسلمان اور سکھ ہرگز نہیں۔ میں مذمت کرتا ہوں۔ اس گنڈہ گردی کی اس لوٹ مار کی اس خون اور آگ کے کھیل کی سب انسانوں کی طرف سے پنجاب کے رہنے والے ہندو سکھ اور مسلمانوں کی طرف سے۔ بولو اے ہمارے ساتھیو! کیا میں ٹھیک کر رہا ہوں؟

اس ڈبے کے سب مسافر ایک ساتھ پکار اٹھے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ سچ کہتے ہیں۔

اس وقت جبکہ چاروں طرف ایک نئی زندگی چھا چکی تھی مولوی صاحب دُور کونے میں چند مسلمان مسافروں کے پاس بیٹھے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ ان کی مشتبہ حرکتیں۔ کسی سازش کا اظہار کر رہی تھیں۔

اچانک گاڑی ..... شاہدرہ جنکشن پر آکر رک گئی۔ ڈبے کا ماحول پھر بکھر گیا۔ چند مسافر اس ڈبے سے اترے لیکن سوار ہونے والے خلاف توقع بالکل نہ تھے۔ اچانک ایک شخص پچھلے ڈبوں کی طرف سے بھاگتا ہوا آیا اور اس ڈبے میں داخل ہوا۔ اس نئے مسافر کی طرف سب متوجہ ہو گئے۔ کیونکہ اُس کی پریشانی اور گھبراہٹ سے معلوم ہوتا تھا اُسے اس ڈبے تک پہنچنے میں بڑی کوفت اٹھانی پڑی ہے۔

سردار جی نے چھوٹتے ہی فرمایا۔ بھائی صاحب اتنی دوڑ دھوپ ناحق کی آپ نے۔ گاڑی چلنے میں تو ابھی کافی وقت ہے۔

نووارد بولا۔ مجھے گاڑی میں بیٹھنا نہیں۔ ایک اطلاع دینے آیا ہوں آپ کو۔

تاجور سامری نے گھبرا کر کہا۔ فرمایئے۔

خاں صاحب اور شیخ جی بھی گھبرا کر کہنے لگے نہ جانے کیا خبر لایا ہے۔

نووارد کہنے لگا، لاہور میں فساد اور گولی چلنے کی خبر تو آپ اخبار میں پڑھ ہی چکے

تھا۔ اور سب حوالدار صاحب کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے، تھوڑی دیر بعد وہ لوٹا۔ اور ہنستے ہوئے بولا۔ پاگل! سب ایکدم ڈرپوک! بارات سے ڈر گیا۔ سردارجی کھسیا کر بولے! بارات!؟

حوالدار نے ہنس کر جواب دیا! ہاں بارات، رائفلیں نہیں تھیں۔ لاٹھی تھی۔ ہی ہی ہی ...... ڈرپوک، چلو اب دیر کرنا مت .... یہ کہہ کر وہ آگے آگے چل پڑا۔ اور اس کے پیچھے وہ انسانوں اور مویشیوں کا ریلہ ———— یہ کلجگ کا انوکھا بھگیرتھ چلتے جسموں کی گنگا لئے جمنا گنگا کی وادیوں کو جا رہا تھا۔

دوپہر ڈھل گئی مگر دھوپ کی تیزی کم نہیں ہوئی تھی۔ بے راہ ویرانے سے انسانوں کا یہ عظیم قافلہ چلا جا رہا تھا۔ اب کہیں سے کسی مشین کی آواز ویرانے کو گونجانے لگی تھی۔ اور اب سب اس آواز کو جلدی ہی پہچان گئے۔ یہ اسی قافلہ کا سفرمینا پانی کی فراہمی کا انتظام کر رہا تھا۔ یہ اس مشین کی آواز تھی، کوئی آدھ گھنٹہ میں اس جگہ پہنچ گئے لوگوں نے آتے ہی ڈیرے ڈالنے شروع کر دیئے۔ ایک طرف ایک بڑا اونچا ٹیلہ تھا۔ اس پر سفرمینا کے انچارج افسر کا ٹینٹ تھا بیچ بیچ کچی پکی پرانی نئی قبریں دور تک پھیلی تھیں۔ ایک طرف ٹھیر رہے ہوئے گدلے پانی کا جوہڑ تھا اور اس ٹیلے کے پار ایک کنوئیں میں بڑے بڑے کنوؤں کے نل لگے تھے۔ آگے کنوؤں کے بڑے بڑے حوض قائم تھے۔ پانی کنوئیں سے نکل کر ان میں بھرتا جا رہا تھا۔ ایک طرف جامن کے چند درخت اس کے سائے میں چند مسلمان ضرورت کی چیزوں کی دکانیں لگائے بیٹھے تھے۔ ان کو فوجی افسروں نے قافلے والوں کی سہولت کے لئے مقررہ نرخوں پر ضرورت کی چیزیں فروخت کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔

تاجور سامری پھرتا پھراتا۔ پانی کے کارخانہ کے قریب سے گزرتا ہوا۔ اور پانی کے لئے لوگوں کو آپس میں دھینگا مشتی کرتے دیکھتا سامنے کے ایکھ کے کھیت میں چلا گیا۔ وہاں گنے کے عاشق لوگ جمع تھے۔ ایک بوڑھا اور ایک نوعمر کسان ایکھ کاٹ کر لوگوں کے ہاتھ بیچ رہے تھے۔ تاجور سامری بھی خریداروں میں شامل ہو گیا۔ لیکن ابھی اُس کی باری دور

تھی۔ وہ لائن میں ہو کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ لوگ کھیت پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ ہر شخص چاہ رہا تھا کہ سب سے پہلے مجھی کو چیز ملے۔ اس کارن آپس میں گالی گلوچ بکواس اور مار پیٹ کی نوبت بھی آجاتی۔ بعض جلدباز لائن توڑ کر کھیت والے سے جا کہتے، بابا! ہم سے دوگنے دام لو اور اور مانگے دو مگر جلدی۔

بوڑھا کسان نہایت تحمل سے جواب دیتا، بھائی سب کو ملے گی ایکہہ، لیکن اس طرح نہیں باری باری سی۔ زیادہ دام میں تم لوگوں سے کیوں لوں —— خدا نے تم پر مصیبت ڈالی ہے۔ میں اگر اُسے ٹال نہیں سکتا تو اتنی مدد تو کر سکتا ہوں۔ یہ سنکر لوگ تھوڑی دیر کو چپکے ہو جاتے، لیکن پھر جلدی ہی اسی بے صبری اور خود غرضی کی نمائش شروع کر دیتے۔ بوڑھا کسان کہتا، بھائیو! اس مصیبت میں تو ذرا میل جول اور صبر سے کام لو۔ مگر وہ لوگ کسی کی نہ سنتے، آخر ان کو آپس میں جھگڑتا دیکھہ کر کسان نے سب کو کھیت سی بانٹ دیا۔

تاجور سامری جب اس جگہ لوٹا تو وہاں اپنے ساتھیوں کو نہ پا کر حیران ہوا لیکن اسی وقت کوی پرکاش نے اسے پکار کر مطمئن کر دیا۔

ٹیلے سے ذرا ہٹ کر ملک کندن لال اور کوی پرکاش اپنا ڈیرا قائم کر چکے تھے۔ تاجور سامری کی ماں بھی بیٹھی تھی جب وہ اسکے قریب پہنچا تو اس کی ماں نے ایسے غصّے سے جس میں محبت اور تنبیہہ بھری تھی، کہا تم کہاں گھومتے رہتے ہو۔ ہمارا تمھیں ذرا خیال نہیں تمہارے بھائی سے صبح کے حادثے کا حال سنکر میرا جی گھبرانے لگا ہے۔ اب میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دونگی ایک ذرا دیر رک کر پھر بولی، تم نے کچھہ کھایا پیا بھی!

تاجور سامری نے جواب دیا۔ ابھی نہیں! پتاجی کہاں ہیں؟

وہ پانی پینے گئے ہیں۔ اس نے جواب دیا! میں آٹا سانے کو ہوں تم اچار لے آؤ۔ دکان سی: ادھر جامن کے نیچے بیٹھے ہیں وہ .... ہاں مجھے معلوم ہے! تاجور سامری

نے جواب دیا۔ اور اٹھ کر اُدھر چلدیا۔ راستے میں رام لبھایا ملا۔ پوچھا کہاں چلے؟ تاجور سامری نے جوابدیا۔ اچار لینے۔

رام لبھایا بولا۔ "میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔"

"آؤ۔" مگر تم کہاں بیٹھے ہو۔

یہ پاس ہی تمہارے،

اور رام لال۔

وہ تو صبح سے مجھ سے الگ ہوگیا ہی۔ قافلے میں بھی دور دور ہی رہا۔ اب اس نے ڈیرا بھی یہاں سے فرلانگ بھر دُور جمایا ہی۔ مجھے بھی تسکین ہے کہ ہر دم کی بک بک جھک جھک سے نجات ملی۔

تم دونوں بھائیوں کا بھی عجیب قصہ ہے! ——— خیر چلو۔ یہ کہہ تاجور سامری چل پڑا ——— دوکان ہر طرف سے گاہکوں گھری تھی۔ دوکاندار بڑے اطمینان اور تحمل سے کام کر رہا تھا۔ یہاں بھی لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ سبھی سب سے پہلے فراغت چاہتے تھے۔ دوکان میں اچار کے علاوہ دال نمک مرچ اور گڑ کی بوریاں بھی تھیں ——— ایک موٹا سا لالہ بھیڑ کو چیرتا ہوا دکان دوکان دار کے پاس پہنچا۔ اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ لوگوں میں حیرت کا عالم تھا۔ دکاندار نے نفی میں سر ہلایا تو وہ لالہ پھر جھکا اور اسکے کان میں کچھ کہنے کے بعد کپڑے میں اس کا ہاتھ لے کر کچھ اشارہ کیا۔ اب وہ شخص جھلا کر بولا، نہیں میں ایسا نہیں کرسکتا۔ میرا مقصد سب کو چیز سستے بھاؤ دینا ہے، تم چاہتے ہو کہ منافع بازی کروں۔ تمہیں شرم آنی چاہیئے۔ اس مصیبت میں بھی تم چور بازار والے اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔

لالہ جی نے اُسے خاموش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اجی سنو تو ذرا۔

دوکاندار بھڑک کر بولا۔ جاؤ نہیں سُنتا، تم مجھ پاؤ پیچھے ایک آنہ منافع دیتے ہو! میں اگر روپیہ ملے۔ تب بھی نہ لونگا۔ میں مسلمان ہوں مجھے خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔ لالہ جی اب نادم سے ہو کر بھیڑ میں لوٹ گئے۔

تاجور سامری کو بھی کسی نے دھکیل کر لائن سے باہر کر دیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ لالہ ایک طرف کھڑے چند آدمیوں سے کچھ کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ اور وہ لوگ بھی بدلے ہوئے تیوروں کے ساتھ سر ہلا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ آخر وہ طیش میں آکر اس بھیڑ میں گھسے اور پکار کر کہنا شروع کیا! ہندو بھائیو تمہیں شرم آنی چاہیئے۔ بے ایمان ملیچھ سے سودا لیتے ہو؟ اس مسلمان قوم کے آدمی سے سودا لیتے ہو جس کے گنڈوں نے ہمارے بہو بیٹیوں اور بوڑھوں بچوں کو چینونٹیوں اور پتنگوں کی طرح مارا ـــــــــــ شرم کرو بھائیو ڈوب مرنے کی جگہ ہے۔

اس شخص کی تقریر نے خوب کام کیا، اب تک جو لوگ بے ضرر گا ہک تھے، اب ان کی آنکھوں میں کٹر ہندو اور گنڈہ پن ناچنے لگا۔ ان کے تیور بدل گئے۔ دوکاندار نے بھی حیران ہو کر اپنا ہاتھ روک لیا۔ اب اسے اپنے چاروں طرف موت ناچتی نظر آنے لگی، بچارا بے بسی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ وہ لالہ جی فاتحانہ شان سے مسکراتے ہوئے آگے بڑھے۔ اور بلی کی سی مکاری سے کہنے لگے، بھائی میں نے تو خطرے سے تمہیں آگاہ کر دیا تھا مگر تم نے میری ایک نہ مانی،

مسلمان دکان دار نے مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لئے کہا۔ اچھا بھائی اب تو سمجھ گیا ہوں۔ تمہارا شکریہ۔ آؤ پھر کیا ارادہ ہے اب!

لالہ جی مسکراتے ہوئے بولے، میں بھی تو انسان ہوں انسان کی مصیبت میں کام نہ آؤں تو پاپی ٹھہروں گا۔ سودا تو گھاٹے کا ہی مگر مدد جو کرنی ٹھہری مگر بھئی اب پہلے بھاؤ نہیں ـــــــــ دوکاندار نے کھسیانا ہو کر بے بسی کے عالم میں کہا۔ اچھا بھائی جو تمہاری

مرضی! بولو کیا دیتے ہو۔ لالہ جی نے اُسے چپکے سے ایک طرف لیجا کر ہاتھ میں کچھ نوٹ تھما دیئے۔ دوکان دار کے چہرے پر رقم دیکھ کر مایوسی اور دکھ کے بادل چھا گئے۔ اور وہ جلدی سے وہاں سے چلدیا۔

اب لالہ جی دکاندار بن چکے تھے۔ بولے ہاں بھئی لو کیا لینا ہی تمہیں ایک شخص بولا۔ پاؤ دال مسور۔

لالہ جی نے کہا! اچھا! نکالو بارہ آنے۔

بارہ آنہ، اچار

چار آنے ایکمد نیبو کے۔ جلدی گانٹھ ڈھیلی کرو۔ سب کو بھگتانا ہی مجھے۔

وہ شخص حیران ہوکر بولا۔ لالہ جی ابھی مسلمان، چار آنے پاؤ دال اور ایک آنہ کا نیبو دے رہا تھا۔

وہ جب تھا دے رہا تھا اب تو میں ہوں۔ یہ بھاؤ منظور ہوں تو لو، ورنہ چلے ہو جاؤ یہ رنگ دیکھ کر اس بھیڑ سے بہت سے گاہک ٹوٹ گئے۔ رام لبھایا نے مجبور ہو کر ایک نیبو لے لیا۔ تاجور سامری بغیر کچھ لئے ہی اس کے ساتھ لوٹا۔

جب وہ اپنے ڈیرے پہنچے۔ تو دن ڈھل چکا تھا، صرف ایک سرخی آسمان اور زمین پر روشنی کئے تھی۔ کوی پرکاش بولا، پتاجی نہیں آئے اب تک۔"

تاجور سامری بہت تھک گیا تھا۔ جھلا کر بولا۔ تو میں کیا کروں، میری ٹانگیں لوہے کی تو نہیں۔ اس کی ماں نے نرمی سے کہا۔ ہے ہے لڑتے کیوں ہو! جانتے تو ہو کہ شام کو اُسے کم سوجھتا ہے اور بوڑھا ستر برس کا ہے۔

تاجور سامری نے قدرے کم تلخی سے جواب دیا۔ جب تمہیں معلوم تھا کہ اُسے شام کے بعد کم سوجھتا ہے تو بھیجا کیوں۔ پانی لینا کوئی آسان تھوڑا ہے ——————

اتنی بھیڑ میں تو اس کا حوض کے پاس پہنچنا بھی مشکل ہی۔ ملک کندن لال بولے

ملک کندن لال بولے - چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں -

کوی پرکاش بولا - روٹی کھالو ، پھر جانا -

کھانا کھا کر تاجور سامری اور ملک کندن لال کرپا رام لاغر کی تلاش میں چلے - پہلے وہ بلائی کے کارخانہ کی طرف آئے یہاں ابھی تک بے پناہ بھیڑ تھی اور کیچڑ دلدل کی صورت اختیار کر چکا تھا - ملک کندن لال لاغر صاحب، لاغر صاحب پکارتے رہے - اور تاجور سامری بھائیا جی بھائیا جی - لیکن جواب کہاں سے لوٹتا - وہاں تو اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی - لوگوں کی بے صبری اور دھینگا مشتی سے تنگ آ کر سفر مینا کے فوجی منتظم ہنٹر باری بھی خوب کرتے ——— اب چاند کافی اونچا آ چکا تھا - اور دودھ جیسی چاندنی نے سارے پڑاؤ کو جگمگا دیا تھا - دیئے - اور الاؤ جو اندھیرے میں خوب چمکتے تھے اب اپنی اہمیت کھو چکے تھے تاجور سامری کا گلا پکارتے پکارتے سوکھ گیا تھا - ملک صاحب صرف چند آوازیں دے کر ہی اپنی بالٹی کے غم میں کھو گئے تھے جو کھوئے ہوئے لاغر صاحب کے پاس تھی - چوک میں آ کر تاجور سامری کی ماں کوی پرکاش اور رام لال بھی مل گئے - رام لبھایا نے پوچھا کوئی پتا چلا ——— ملک کندن لال نے نفی میں سر ہلا دیا ——— تاجور سامری کی ماں نے ایک گورکھا سپاہی سے مدد کے لئے التجا کی ! وہ سپاہی پہلے تو کچھ نہ سمجھا - کیونکہ اس نے پنجابی زبان میں التجا کی تھی - لیکن جب رام لبھایا اور ملک کندن لال نے اسے سمجھایا تو وہ کوی پرکاش سے بولا -

تو مارا پنیًا ! کیہریا رام ! یو کارو ، او تو ڈُھکیتھے !

او تو کیتھے - پیتا جی !

تاجور سامری نے جواب دیا - بہت پکارا اُسے ساتھی !

تو گھبرانا مت ! میں جائیگا - ڈھونڈھو ! چنتا نہ کرو -

یہ کہہ کر وہ اپنے بستر پر لیٹ کر پاؤں کی انگلیاں چٹخنے لگا -

مایوس ہو کر سب ڈیرے کو لوٹے۔ تاجور سامری کی ماں نے کھانا نہ کھایا سب ایک افسوس اور اداسی کے عالم میں تھے۔ تاجور سامری کی ماں رہ رہ کر خود بخود کہنے لگی۔ نہ جانے کہاں ہوں گے وہ کہیں کسی گڈھے میں گر پڑے تو شریر روگی ہو جائیگا۔ رات کو سردی ہے کپڑا بھی کوئی پاس نہیں اُن کے۔

رام لبھایا نے حوصلہ بندھاتے ہوئے کہا۔ ماتا جی گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ لاغر صاحب ضرور خیریت سے ہوں گے۔ اور صبح ضرور مل جائیں گے۔ یقین رکھو۔ یہ کہہ وہ اپنے ڈیرے کو چلا گیا، اور یہاں افسردہ سی خاموشی چھا گئی۔ کوی پرکاش لیٹتے ہی سو گیا اور تھوڑی بعد تاجور سامری بھی،

دوسرے دن! کرپا رام لاغر قافلے کے جرنیلی سڑک پر پہنچتے ہی اپنے ساتھیوں سے آملا تھا، اور وہ سب پھر ایک جوش اور زندگی کے احساس کے ساتھ چل رہے تھے۔ بارہ ابھی نہیں بجے تھے۔ لیکن دھوپ کی تیزی برداشت کے قابل نہیں تھی۔ رائے وِنڈ سے گزرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی قبرستان سے گزر رہے ہوں۔ بازار سُنسان، مکان خاموش بالاخانے سونے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ نہ جانے لوگ کہاں چلے گئے تھے۔ اب یہ انسانی دھارا۔ بستی سے دُور کچی کشادہ سڑک کو طے کر رہا تھا۔ تاجور سامری، اور کوی پرکاش نے پانی کی بوتلیں بھر کر اپنی کمر سے باندھ لی تھیں۔ اِن کے ماں باپ اب سائے کی طرح ان کے ساتھ تھے۔ ننھی چیکی تاجور سامری کی ماں کی انگلی تھامے چلی جا رہی تھی، رام لبھایا اور رام لال اپنے کنبوں کو ساتھ لئے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو دیکھتے چلے جا رہے تھے۔

تاجور سامری نے ایک بوڑھے کو دیکھا۔ بہت سے کپڑے اپنے جسم سے لپیٹے جھاتا تانے، گھسٹتا ہوا چلا جا رہا۔ ہتا پاس پہنچا تو پہچان گیا۔ یہ لائلپور گورنمنٹ کالج کے پروفیسر پنڈت گومتی پرشاد کا مالی تھا۔ اس بڈھے نے بھی اچانک گھوم کر دیکھا اور تاجور سامری

کو پہچان کر سلام کیا، تاجور سامری نے پوچھا، تم اپنے وطن نہیں جا سکے۔ بابا!

مالی نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ کہاں صاحب! پنڈت گرمتی پرشاد نے مجھ سے دغا کی۔ اپنی خود غرضی کے لئے مجھے روکے رکھا اُن کا اسباب مال تو بچ گیا مگر مجھے ساتھ نہ لے گئے۔ آخر تک مجھے دھوکا دیتے رہے ——— تاجور سامری نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ بابا خاطر جمع رکھو اب بھی تم وطن ضرور پہنچو گے۔

بوڑھے مالی نے اداس لہجے میں جواب دیا۔ کون جانتا ہے ابھی کیا ہوگا۔ میرے شریر میں اب طاقت نہیں! یہ کہہ وہ پھر گھسٹنے لگا، تاجور سامری بھی تیزی سے چل کر اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔

آج کے سارے سفر میں کہیں پانی نہ ملا۔ نہ بہتا نالا۔ نہ چلتا کنواں۔ اور جو کہیں کوئی کنواں نظر آیا تو بغیر چرخی کے اس میں جھانکتے تو انسانی لاشوں کی سڑاند سے دماغ پھٹنے آتا۔ اب دھوپ کی تیزی نے پیاس کی شدت کو اور بھی بڑھا دیا تھا تاجور سامری نے اپنی کمر سے دو بوتلیں کھول اپنے ماں باپ میں بانٹ دیں اور ہدایت کی کہ شدید پیاس کے وقت ہی ایک گھونٹ پانی پئیں آج آثار اچھے نہیں۔ ابھی وہ اپنی بات ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ ایک جوان عورت پیاس سے نڈھال ہو کر گر پڑی۔ تاجور سامری جب تک اس کے پاس پہنچے، وہ عورت دم توڑ چکی تھی۔ اس کا کوئی وارث نہ تھا چلنے والے اس پر صرف ایک نظر ڈال کر چل دیتے ——— ایک ادھیڑ عمر کے سکھ جاٹ نے ہری ہری کپاس میں ایک سال بھر کے بچے کی لاش پھینک دی۔ اور روتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جہاں تاجور سامری کھڑا تھا وہاں ایک بوڑھا آدمی بے دم ہو کر گرنے کو ہوا۔ تاجور سامری نے سہارا دیکر اسے ایک طرف بٹھا دیا۔ بوڑھا بول نہ سکا۔ صرف ہاتھوں کو منہ کی طرف لے گیا۔ تاجور سامری نے اپنی بوتل اس کے منہ سے لگا دی، جسے وہ بوڑھا غٹ غٹ پی گیا۔

کوی پرکاش نے پکار کر کہا اب چھوڑو اسے۔ سفر بھی طے کرنا ہی ہمیں۔ اس بوڑھے نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ میں اب ٹھیک ہوں۔ شکریہ۔ آپ اب جا سکتے ہیں۔

تاجور سامری اس سے مطمئن ہو کر اپنے ساتھیوں میں جا ملا۔ ہر طرف ایک کہرام مچا تھا ہر شخص پانی پانی چلا رہا تھا۔ لوگ ادھر ادھر درختوں کے سائے میں پیاس کے مارے گرے جاتے تھے۔ تاجور سامری نے اونچے گلے سے کہنا شروع کیا۔ بھائیو! وہ سامنے قریب ہی نہر ہے۔ وہاں پانی ضرور ہوگا۔ چلو، ہمت نہ ہارو۔ چند قدم کی بات ہے۔

یہ امید افزا اعلان اس نے کئی جگہ اونچی آواز سے کیا۔ اس سے لوگوں میں ایک انتشار پیدا ہو گیا اور سب بے تحاشا اُس ہریالی کی دیوار کی طرف دوڑ پڑے۔

یہ ایک بڑی نہر تھی۔ لیکن پانی سے خالی، پیاسے لوگوں نے اس کی گیلی ریت کو کپڑوں میں ڈال کر نچوڑا۔ اور اپنے حلق تر کئے۔ بہتوں نے کئی ہاتھ گہرائی سے کھود کر پانی نکالا۔ اور اپنی پیاس بجھائی۔ اس دوران میں پانی سے بھری فوجی موٹر بھی آگئی اور سب کو اس مصیبت سے نجات ملی۔

راجہ جنگ کے متعلق لوگوں میں دہشت سی پھیلی تھی کہ وہاں لوگ اکثر قافلوں پر حملہ کر دیتے ہیں، لیکن جب وہاں سے گزرے تو دور تک کوئی آدمی کیا چڑیا بھی نظر نہ آئی۔ ٹوٹے پھوٹے کلسوں والے مندروں سے مسجدوں کے اونچے مینار شان سے اکڑتے نظر آتے تھے۔ لیکن شہر والے نہ جانے کہاں جا چھپے تھے۔ ریلوے لائن کے قریب سے گزرتے ہوئے تاجور سامری نے اس اداس فضا سے گہرا اثر لیا۔

دن ڈھلنے کے بعد اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اور تھل پور نیگلے سے ذرا ادھر ایک اونچے کنارے کے نہری نالے کے پاس سڑک کے کنارے پڑاؤ ہوا۔ تاجور سامری اپنے ساتھیوں کے ساتھ آج بہت دیر سے پہنچا۔ جگہ رُک چکی تھی۔ سڑک کے کنارے ہی تھوڑی جگہ خالی پڑی تھی۔ وہیں بیٹھ گئے۔ عورتیں فوراً کھانے پکانے میں لگ گئیں۔ مرد

لکڑی پانی کو چلدیئے۔ تاجور سامری نالے کے اونچے کنارے کے پار چلا گیا۔ اُسے وہاں گئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ایک ہنگامہ نے سر اٹھایا۔ خالی سڑک پر فوجی لاریاں راجہ جنگ کی طرف دوڑنے لگیں۔ پڑاؤ والوں میں خوف اور بے اعتمادی کا سماں چھا گیا۔ پانی والی مشین کی آواز کے ساتھ اب گھبرائی ہوئی انسانی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ تاجور سامری گھبرا کر اپنے ڈیرے کو آیا۔ اس کی ماں بھائی اور باپ گھبرا رہے تھے۔ ننھی نے چھک کر کہا۔ اوہ ماما آگیا ماما...... اس کے بعد وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ کیونکہ تاجور سامری کی ماں نے اُسے جھڑک دیا تھا اور وہ بچاری بجھ کر رہ گئی تھی۔ ایک بوڑھی عورت اور ایک مرد شور مچا رہے تھے، لوگو! لٹ گئے۔ ہم۔ ہماری عزت لُٹ گئی۔ کوئی مدد کرو۔ پرماتما کے لئے کوئی دوڑو۔ ہم لُٹ ایک گورکھا فوجی دوڑتا ہوا آیا۔ کیا شور مچاتا۔ گھبرانا کیا۔

بوڑھے نے دھاڑ مار کر کہا۔ حضور میری لڑکی کھو گئی۔ اس نالے کے پار مسلمان اسے اٹھا لے گئے۔

گورکھا بولا۔ گھبرانا مت، ہم دیکھتا ابھی! صبر کرو! یہ کہہ وہ اپنی رائفل لے کر نالے کی طرف بھاگا۔

اس افراتفری کا کارن یہ تھا کہ کسی نے افواہ اڑا دی تھی کہ راجہ جنگ کے نزدیک قافلے پر حملہ ہوا۔ اور مسلمانوں نے کئی چھکڑے لوٹ لیے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد پتا چلا کہ یہ محض افواہ تھی، ہر طرف اب اطمینان کی لہر دوڑ رہی تھی۔ مگر وہ دونوں بوڑھا بوڑھی ابھی چیخ رہے تھے، اچانک ایک جوان لڑکی نے آکر کہا۔ بابو! —— بوڑھی چونکی! دیا لو، اور اس کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

بوڑھا پکارا آگئی دیا لو۔ کہاں تھی تو؟

اس لڑکی نے جوابدیا! ان سرکنڈوں میں چھپی تھی —— وہ اپنی بات بھی ختم نہ کر پائی تھی کہ بڑھیا چنگھاڑی، اری تیرے کان......؟

عنوان

	صفحہ
تعارف	۵
بندٹوٹتا ہے۔	۱۳
آگ بھڑک گئی	۵۴
موت اور زندگی کے بیچ	۱۱۰
قافلہ چل پڑا	۱۴۸
آزاد دھرتی پر	۲۰۰

ہوں گے؟

فساد اور گولی کا نام سُن کر سارے ڈبے میں ایک ہراس کا عالم چھا گیا۔ خان صاحب اور شیخ جی اور سردار جی تو خوف اور حیرت سے بھونچکے رہ گئے۔ اُن کے چہرے سفید پڑ گئے، وہ کہنے لگا کل شام سات بجے سے صبح سات بجے تک لاہور کے ڈپٹی کمشنر نے دس دن کے لئے سخت قسم کا کرفیو لگا دیا ہے۔ آپ سب شہر میں داخل ہونے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ .....

..... گولی ماردی جائے شاید ——— یہ کہہ کر فوراً اتر کر دوسرے ڈبّے میں داخل ہو گیا۔ اور اس ڈبے میں ایک دہشت آمیز خاموشی چھا گئی۔ سب نہ جانے کیا سوچنے لگ گئے شیخ جی سے لیکر خوش طبع سردار جی تک سبھی خوف اور سوچ کے سمندر میں غرق ہو گئے تھے مسافروں میں اب سرگوشیاں چلنے لگیں مولوی صاحب کا ٹولہ زیادہ حرکت میں تھا۔ مولوی صاحب کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور آنکھوں کے پراسرار پھراؤ سے ایک خوفناک اشتباہ جنم لے رہا تھا۔ مسافر اب ایک دوسرے کو شبہ اور خوف سے بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے معلوم ہوتا تھا خلوص اور بھروسا پر تولے ہوئے ہے، ہر شخص کے چہرے سے صاف ٹپکتا تھا کہ اسے یہ خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں ان ہندو سکھوں اور مسلمانوں میں کوئی گنڈا بھیس بدلے نہ بیٹھا ہو۔ اب گاڑی بادامی باغ کے نمبر ۲ پلیٹ فارم پر آکر رُک گئی۔ پلیٹ فارم پر سناٹا اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ گیٹ کے پاس ضرور کچھ آدمی نظر آرہے تھے۔ اچانک کونے کا دروازہ کھلا اور مولوی صاحب اپنے ٹولے کو ساتھ لے پھرتی سے اتر کر دوسرے ڈبّے میں سوار ہو گئے۔ شاید اُس ڈبّے میں مسلمان زیادہ تھے۔ اب جبکہ فساد کا بھوت ناچ اٹھا تھا تو شاید انکے لئے یہ قدم اٹھانا لازم ہو گیا تھا۔

خاں صاحب غصّے سے بولے۔ ڈرپوک ——— وہاں تو فولادی قلعے میں چلے گئے۔

بوڑھا بھی چونکا! کیا ہوئیں بالیاں۔

لڑکی کو خاموش دیکھ کر بوڑھی نے اُسے پیٹنا شروع کیا، اور بوڑھے نے گالیاں بکنا بے حیا! آوارہ! کیا کیں بالیاں۔ کس یار کو دیں بالیاں.......... وہ گورکھا ہوٹا، داس لہجے میں بولا،

لڑکی نہیں ملی۔ پھر اس ہنگامے کو دیکھ کر کھٹکا، لڑتا کیوں! یہ لڑکی کون؟

مگر وہ دونوں گالیاں بکتے جا رہے تھے۔ آخر لڑکی نے جیب سے دونوں بالیاں ایک چیتھڑے میں لپیٹی نکال کر بوڑھی کے حوالے کیں۔ اس پر ان دونوں کا رویہ بدل گیا۔

بوڑھی بولی۔

شکر ہے پرماتما تیرا۔ بوڑھے نے کہا واہگورو کی کرپا ہوئی، ورنہ لڑکی نے تو ہمیں برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

گورکھا یہ حال دیکھ کر لوٹ گیا۔

کھانا کھا کر تا جور سامری لیٹ گیا اور تھکاوٹ کے کارن تھوڑی ہی دیر میں سو گیا۔

آزاد دھرتی پر

آخری کم سفر ہونے کے باوجود آج کی مسافت ذرا کڑی اور تکلیف دہ تھی۔ کچی سڑک کی سوکھی دلدلی مٹی میں چھکڑے تو چھکڑے گائے بھینس کی ٹانگیں ہاتھ ہاتھ بھر تک زمین میں دھنسی جا رہی تھیں۔ تھکے اور اُدیے ہوئے لوگ جواہر لال اور گاندھی کو کوستے ہوئے جا رہے تھے۔ تاجور سامری تھکاوٹ سے چور ہونے کے کارن بچ گیا تھا۔ چنانچہ پکی سڑک شروع ہوتے ہی وہ باپ بھائی سے ناراض ہو کر سائیکل پھینک پیدلوں کے ساتھ چل دیا۔

قصور، اس سڑک سے آدھ میل سے کم نہ ہوگا۔ یہاں آبادی کے نشان ضرور تھے لوگ شہر کے باہر کے سرکاری باغ کے اوپر سے جاتی ہوئی سڑک سے جا رہے تھے۔ سڑک زمین سے خاصی اونچی تھی۔ نیچے ایک ندی بہتی جا رہی تھی۔ اسکے پار ایک اونچا ٹیلا۔ ٹیلے سے دو فرلانگ ہٹ کر پکی سڑک کے کنارے مشرقی پنجاب سے آیا ہوا مسلمانوں کا قافلہ پڑاؤ ڈالے تھا۔ اس لئے یہ قافلہ ٹیلے کے پہلو سے ہو کر پھر ایک پتلی سی کچی سڑک سے ہو نکلا آگے ایک چھوٹی سی نہر کے کنارے بہاری اور مدراسی ملٹری کا ملا جُلا کیمپ تھا۔ بہاری سپاہی دھوتیاں پہنے ننگے سر پر کی چوٹیاں ہلاتے لوگوں کو پانی پلا رہے تھے۔ ایک بڑی بھیڑ یہاں رُک گئی لیکن تاجور سامری تیزی سے چلتا گیا۔ آج اس نے سرحد پار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بیچش اور تھکاوٹ نے اگرچہ اسے کھوکھلا کر دیا تھا مگر آزاد

میں کمزوری نہ آئی۔ لیکن یہ ضد کہاں تک آخر نڈھال ہو کر سڑک کے ایک طرف گر پڑا۔ اسی وقت اس کے قریب ایک ٹرک آکر رُکا اور ایک بہاری فوجی نے اسے اٹھا کر ٹرک میں ڈال دیا۔ تاجور سامری کے حواس اگرچہ بجا تھے۔ مگر کمزوری کے کارن ادھ موا سا تھا اس کے چاروں طرف آدمی اس طرح بھرے تھے جیسے کٹ گھرے میں مرغ مرغیاں دھیرے دھیرے اسے بیٹھنے کو جگہ مل گئی۔ اور وہ ایک طرف لگ کر اونگھ سا گیا۔ اچانک ہندوستان زندہ باد۔ مہاتما گاندھی زندہ باد کے نعروں سے چاروں کونٹ گونج اٹھے لوگ کود کود کر ٹرک سے زمین پر آنے لگے۔ تاجور سامری بھی اترا۔ بیشمار لوگ جمع تھے جو ہندوستان زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ تاجور سامری کی ہمت تازہ ہوگئی اور وہ امید بھرے دل کے ساتھ آگے بڑھا۔ ٹرک کی بائیں جانب پیپل کے نیچے ایک میز پر بڑی بڑی بوتلیں رکھی تھیں۔ اس کے قریب ایک کپڑا لٹک رہا تھا۔ جس پر لکھا تھا۔ ہسپتال۔ مارواڑی ریلیف کمیٹی۔ اس سے پرے دکانیں۔ دائیں طرف بھیڑ سے معمور کنواں اسے پیاس محسوس ہوئی اور بھوک نے بھی سر اٹھایا۔ اور وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ لیکن اسکی حیرت کی حد نہ رہی جب دو چار لٹھ بندوں نے اسے یہ کہہ کر روک دیا۔ ٹھیرو آگے کہاں جاتے ہو؟ یہی حالت باقی لوگوں کی تھی۔ ایک شخص نے کہا، تم ہمیں اپنے دیش میں جانے سے کیوں روکتے ہو، ہم تھکے ہوئے ہیں، ہماری راہ چھوڑ دو۔ ایک موٹا سالال آنکھوں کو غصے سے گھما کر بولا۔ اتنے کیوں مرے جاتے ہو۔ ٹھیرو ذرا۔ ٹیکہ تو لگوا لو۔ یہ کہہ اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے ان سب کو بھیڑ، بکریوں کی طرح لاٹھیوں سے گھیر کر اس ہسپتال میں پہنچا دیا۔ ڈاکٹر، جو ڈاکٹر سے زیادہ بھڑ بھونجا دکھائی دیتا تھا۔ سرنج لئے ہر ایک کے بازو میں اس طرح لگا رہا تھا جیسے وہ کوئی انتقام لے رہا ہو۔ ان سے۔ تاجور سامری انجکشن سے بہت گھبراتا تھا جب اس کی باری آئی اور دیکھا تو سرنج کی سوئی ٹوٹی ہوئی تھی اور ٹیوب خالی۔ اس

نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب دوا تو بھر لیجئے۔ خالی انجکشن کیا ہوگا! ڈاکٹر صاحب نے گھبرا کر اسکی بانہہ چھوڑ دی۔ اور دوائی بھرنے لگا۔ تاجور سامری کو کسی نے پیچھے سے دھکا دیا اور وہ لڑھک کر ان لوگوں میں جا گرا۔ جو ٹیکا لگوا چکے تھے۔ اس طرح وہ بچکر آگے نکل گیا۔

اندھیرا ہو گیا تھا۔ تاجور سامری کو شہر میں داخل نہ ہونے دیا گیا۔ پاکستان سے آنے والوں کے لئے یہ پابندی لگائی گئی تھی۔ وہ پھر اسی جگہ آیا۔ بھوک سے اس کا برا حال تھا۔ ہسپتال والے اپنا کام ابھی جیسے تیسے کر رہے تھے۔ کنوئیں پر کی بھیڑ بھی اسی طرح تھی۔ گوردوارے کے بڑے دروازے پر لوگ جمع تھے۔ یہاں دال روٹی تقسیم ہو رہی تھی۔ لیکن بیشمار لوگ شکایت کر رہے تھے۔ کہ یہاں سکھوں ہی کو پرشاد ملتا ہے۔ ہندوؤں کو سر گھما کر رگید دیا جاتا ہے۔

تاجور سامری دیر تک لائن میں کھڑا رہا آخر اس سے نہ رہا گیا اور دربان کی نظر بچا کر دیوڑھی میں گھس گیا۔ لیکن دربان نے دیکھ لیا۔ اور لپک کر اسے گردن سے پکڑا اور باہر کو دھکیل دیا۔ ایک جوان عورت دربان کو کوس رہی تھی اور چیخ چیخکر کہہ رہی تھی کہ اس بدمعاش نے میری چھاتیاں نوچی ہیں۔ ایک سردار جی اس پر برس پڑے چڑیل کیا بکتی ہے۔ گوردوارے کے سیوکوں پر لانچھن لگاتی ہے۔ دور ہو جا میرے سامنے سے ورنہ کھال اُدھیڑ دونگا۔ لوگ بھی روٹی ملنے کے لالچ میں اسی عورت کو ملزم گردان رہے تھے۔

تاجور سامری نے ناامید ہو کر ایک دکان سے کئی دنوں کے باسی پکوڑے چار آنہ کے لئے۔ پکوڑے چھٹانک سے زیادہ نہ ہونگے۔ لیکن دوکاندار کہہ رہا تھا اگر یہ پاؤ بھر سے کم ہوں تو ہاتھ کٹوا دوں۔ ایک پولیس کے حوالدار نے جو وہاں بیٹھے مفت چائے پی چکے تھے۔ نہ صرف دکان دار کے جھوٹ کی پرزور تائید کی بلکہ تاجور سامری کو جھڑک کر کہا بھلا چاہتا ہے تو چلا جا یہاں سے ورنہ حوالات میں ڈال دوں گا۔

اٹھائی گیرا کہیں کا۔ بدمعاش بے ایمانوں کے ملک سے اگر سبھی کو بے ایمان سمجھتا ہے۔ تاجور سامری یہاں سے دکھی ہو کر گوردوارے کے پہلو کی ایک بند دکان کے برآمدے میں آکر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اور ان باسی پکوڑوں کو تنور شکم میں ڈالنے لگا۔ اچانک ایک زنانے کی گالی نے اسے چونکا دیا، اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہی دربان جی تھے۔ اور ساتھ اس کے وہ حوالدار صاحب! دربان جی نے چلے پھنکے انداز میں دریافت فرمایا، تو یہاں کیوں بیٹھا ہے؟ کیا دکان کے تالے پر نظر ہے۔ حوالدار صاحب نے تائید کرتے ہوئے اضافہ فرمایا کہ یہ شرنارتھی بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ جی! شکل مومناں کرتوت کافراں، ہم نہ آتے ڈھونڈتے کل کو۔

تاجور سامری نے لجاجت سے کہا۔ سردار جی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایسا شخص نہیں جیسا آپ سمجھ رہے ہیں میرے ساتھی پیچھے رہ گئے ہیں۔ کپڑے ان کے پاس ہیں۔ آج کی رات یہاں کاٹنی ہے۔

دربان جی کے کڑکے، رات کاٹنی ہے۔ جیسے باپ کی جائداد ہو۔

تاجور سامری نے جل کر جواب دیا، باپ کی جائداد تو رہ گئی پاکستان میں۔ اب یہ سب کچھ ہمارا ہی ہے۔

حوالدار نے اسے گردنی دیکر کہا۔ اٹھتا ہے کہ دوں ایک جھانپڑ۔ تاجور سامری باہر دھول میں گر پڑا تھا۔ کپڑے جھاڑتا اٹھا۔ اور جدھر سے آیا تھا اُدھر کو چلا کہ شاید آگئے ہوں ان کے ساتھی۔ اچانک رام لبھایا سے اسکی مٹھ بھیڑ ہوگئی، اس نے کہا۔ تمہارے ماں باپ تمہارے لئے پریشان ہو رہے ہیں۔ اور تم یہاں آوارہ پھر رہے ہو۔ چلو، یہ کہ وہ پھر ڈیرے کو لوٹا،

کنوئیں سے فرلانگ بھر ہٹ کر آج ڈیرا لگایا گیا تھا۔ چاندنی کھل چلی تھی تاجور سامری کو آتے دیکھ کر اس کے ماں باپ اور بھائی خوش ہوگئے۔ اور وہ بھی اس ماحول میں آکر وہ جھاڑ جھپٹ بھول گیا۔ اس کی ماں نے کھانا اس کے آگے رکھا جسے اس نے بڑے

مزے سے کھایا، اور پھر بچھتے ہوئے بستر پر لیٹ گیا۔ آج اسکا باپا ایک پرانی کہانی کہہ رہا تھا۔ آج یہ سب خوش تھے، مگر تاجور سامری اس آزاد دھرتی پر اپنے استقبال سے دکھی ہو رہا تھا۔ اور وہ اپنے ہی خیالوں کی ادھیڑبن میں کھو گیا۔

دن نکلتے ہی ڈیرا اٹھا کر ہسپتال والے پیپل کے سامنے کنویں کے پہلو والی پکی حویلی کے ساتھ جما دیا گیا تھا۔ ٹھیلے والے جھیور کی باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ یہی شاہنی کی نظر پڑا رام لال نے پکارا تو وہ ان کے پاس آ گیا۔ ٹھیلے کے متعلق پوچھا گیا۔ تو اس نے اکھڑے اکھڑے انداز میں جواب دیا۔ سامان زیادہ ہونے کارن کچی سڑک پر ٹھیلہ چلتا نہیں تھا۔ اس لئے آپ سب کا سامان ایک جاٹ کے چھکڑے پر لاد دیا۔ لیکن اس کی بات کا کسی کو یقین نہ آیا۔ اس کی آنکھیں کچھ اور ہی کہہ رہی تھیں، رام لال چپکے سے اٹھ کر تھوڑی دیر میں تھانے سے ایک سکھ حوالدار اور دو سپاہی لے آیا۔ یہ حوالدار وہی رات والے تھے جن سے تاجور سامری کو زک اٹھانی پڑی تھی۔ حوالدار نے آتے ہی دو تین موٹی موٹی گالیوں سے اس جھیور کی تواضع کی اس سے اس کے چہرے کا رنگ اتر گیا۔ شاید وہ کچھ اصلیت کہہ ہی دیتا کہ عین اسی وقت اس کے ساتھی بھی آ گئے۔ اور معاملہ بگڑنے سے بچ گیا ایک مکروہ صورت والے شخص نے حوالدار کو ایک طرف لے جا کر نہ جانے کیا کہا۔ وہ اپنی قمیص کی جیب کو سنبھالتے ہوئے آئے اور سپاہیوں سے کہنے لگے چلو بھئی یہ بات ہمارے بس کی نہیں۔ شرنارتھیوں کے معاملہ میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ کہ وہ تھانے کو لوٹ گیا اور سپاہی اس کے پیچھے چل دیئے۔ اب وہ جھیور سنبھل چکے تھے۔ اور سب یہی کہتے تھے سامان ہم نہیں گم کیا۔ لیکن عورتیں چیخ چیخ کر ان سب کو مجرم ثابت کر رہی تھیں رام لبھایا جو اسی بیچ میں کہیں چپکے سے اٹھ گیا تھا۔ اب دو تین ڈوگرہ فوجیوں کے ساتھ آ گیا۔ ایک ان میں صوبہ دار تھے دو حوالدار، اس نے آتے ہی اس جھیور کو دو تین جھانپڑ جڑ دیئے اور کہا سامان تمہیں نے گم کیا ہے۔ اب جہاں سے چاہو لاؤ ورنہ گولی

ماردوں گا۔ یہ کہہ کر اس نے پستول نکال لیا۔ حالات پھر اپنے خلاف دیکھ کر وہ جھبور تاجور سامری کی ماں اور باپ کے قدموں پر گر پڑا۔ اور گڑگڑا کر کہنے لگا۔ میری مدد کرو۔ مجھے بچاؤ کرپا رام لاغر نے جواب دیا۔ تم نے ہم سب کے ساتھ دغا کی ہے اب اس کا بدلہ بھگتو، ہمارا سامان دوجہاں گم کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سبھی عورتیں مرد اُس پر گالیوں سے برسنے لگے۔ وہ شخص جس نے پولیس کے حوالدار کو رام کیا تھا۔ اب صوبہ دار کو ایک طرف لیجا کر کچھ سمجھایا، صوبہ دار نے جلدی سے وہ کاغذ پتلون کی جیب میں ٹھونسا اور لوٹ کر کہا، دیکھو، بھائیو میرا ایک فیصلہ ہے۔ اس کو مانو گے، دیکھو سب فائدے میں رہو گے۔

سب نے ایک آواز سے جواب دیا، ہاں ضرور مانیں گے۔

صوبہ دار نے کہا۔ اچھا تو پھر میرا فیصلہ ہے۔ یہ ——— ٹھیلے کی قیمت اور کرائے کے روپے تمہیں لوٹا دے۔ یہ بات ابھی اس نے ختم بھی نہ کی تھی۔ کہ اس جھبور نے ڈیڑھ سو روپیہ نکال کر ان کے سامنے ڈال دیا۔ اور صوبہ دار فیصلہ کر کے دوسروں کی منظوری کا انتظار کئے بغیر اپنے ساتھیوں کو ساتھ لیکر چلا گیا۔

سامان گم ہو جانے سے سبھی دکھی تھے۔ رام لبھایا کی بیوی کا بُرا حال تھا۔ اس کے سامان میں نہایت قیمتی چیزیں تھیں۔ ریشم کے کپڑے اور چاندی کے برتن تھے۔ شاہنی کا ایک بستر اجس میں کام کی چیزیں بھی نہیں مل گیا تھا۔ تاجور سامری کے سامان سے ایک قدِ آدم آئینہ دو بڑی تصویریں نہرو اور گاندھی کی ملیں۔

کوی پرکاش اپنے سوٹ کیس کو رو رہا تھا۔ جس میں اس کی ادبی کمائی کے پانچ سو گیتوں کا مسودہ اور بہت سی قیمتی چیزیں تھیں۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ سب افسردہ تھے۔ تاجور سامری کی ماں افسردہ تھی کہ اس نے بستر میں دو سال کے خرچ کا کپڑا باندھا تھا، لیکن وہ اب اپنے بیٹوں کو دلاسا دے رہی تھی کہ فکر نہ کرو، ہمارا سارا سامان تو ہندوستان میں پہلے ہی محفوظ ہے۔

شام تک ہندوستان کے رہنے والے اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی خیریت پوچھتے رہے۔ ان کی قیمتی چیزیں کوڑیوں کے داموں خرید کر پولیس اور فوج کے ساتھ ملکر دھمکا کر منت بنا کر ان کا بوجھ ہلکا کرتے رہے، سونا تیس روپے تولہ سے لیکر پچاس روپے تک ہتھیایا گیا۔ تولہ کا ڈیڑھ تولہ ہونا تو معمولی بات تھی۔ تاجور سامری کے پرانے کرم فرما پولیس کے سکھ حوالدار دو تین مرتبہ اس کی مزاج پرسی کو آئے، اور نہایت ہمدردی ظاہر کی۔ اور چلتے وقت چپکے سے مشورہ دیا کہ یہ سائیکل اور آئینہ چوری کے معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں اونے پونے کسی کو بیچ دو، مفت کی مصیبت مول لینے سے کیا فائدہ۔ مگر تاجور سامری چپکا ہی رہا۔ ان کی دیکھا دیکھی ایک اور ریٹائرڈ جمعدار صاحب کو بھی تاجور سامری سے ہمدردی جتانے کا خیال آیا۔ اور وہ ایسے انداز سے ان کے ڈیرے کے پاس آکر رک گئے جیسے بازار کے چودھری ہوں، اور بولے ہے ہے کتنی گندگی ہے۔ پر یہ بچارے شرنارتھی کیا کریں ڈیوٹی تو ریلیف کمیٹی کے آدمیوں کی ہے۔ پھر کرپارام لاغر سے متوجہ ہوئے۔ کیوں باباجی آپ کہاں سے آئے ہیں۔

لاغر صاحب نے جواب دیا۔ لائلپور سے۔

اب سردار صاحب وہیں بیٹھ گئے۔ اور فوراً ہی بات کا رُخ بدل کر کہنے لگے، مجھے آپ کے دُکھ سے بڑی ہمدردی ہے۔ کرپارام لاغر نے جواب دیا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ وہ کچھ فرمائش کرنے کو تھے۔ کہ سردار صاحب نے پھر لب کھولے۔ آپ کو روپے کی ضرورت ہوگی بہتر ہو آپ یہ سائیکل اور آئینہ بیچ دیجئے۔

تاجور سامری نے اب لغیران کی مزید بات سُنے بھڑک کر کہا۔ مہاراج آپ کرپا کر کے یہاں سے سدھاریئے۔ ہمیں آپ کی ہمدردی کی ضرورت نہیں، سردار صاحب پیچ و تاب کھاتے چلے گئے۔

تاجور سامری کو اُس کے ماں باپ نے بہت سخت سست کہا کہ گھر آئے سے تم اسطرح

پیش نہ آیا کرو۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ مگر اس نے کچھ جواب نہ دیا، اور آئینہ پر کپڑا پھیرنے لگا، جاٹ جھکڑے لیئے اپنے اپنے گانوؤں کو جا رہے تھے۔ آج کل جیسی بھیڑ نہ تھی۔ لیکن سڑک کے دونوں کنارے بیمار اور خراب حال شرنارتھی پڑے تھے، گوردوارے کے سامنے ایک لاوارث عورت موت اور زندگی کے درمیان لٹک رہی تھی۔ کوئی اس کی سدھ نہ لیتا تھا ایک بوڑھا جو ہسپتال کے قریب ہی بیمار پڑا تھا۔ آج مر گیا۔ اس کی لاش دیر تک پڑی رہی، آخر چند سکھ جاٹوں نے اس کو اٹھایا اور ہسپتال کے بغل والے کھیت کو چلدیئے۔ ایک لاش اور اس کے پیچھے جاتی دکھائی دی۔ تاجور سامری نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا، شمشان اس طرف ہے۔ ڈاکٹر نے جواب دیا، نہیں، شرنارتھی شہر کے شمشان میں مردے نہیں جلا سکتے۔ تاجور سامری نے حیرت سے آنکھیں اس پر گاڑ کر کہا پھر یہ......؟

ڈاکٹر نے بے پروائی سے جواب دیا، اِدھر دُور کھیتوں میں جا کر دبا دیں گے، اِن لاشوں کو! یہاں کونسی لکڑیاں فالتو ہیں۔ یہ شرنارتھی تو مرتے ہی رہیں گے۔

تاجور سامری اُداس ہو کر ڈیرے کو پھرا۔ یہاں آکر اُسے پتا چلا کہ آج ایک گاڑی امرتسر جائیگی۔ اس کا جی اس ماحول سے اُوب گیا تھا، اس نے اپنی والدہ سے پوچھا چلا جاؤں امرتسر؟ اس نے جواب دیا، تمہاری مرضی، تاجور سامری بغیر کچھ اور کہے اپنے مسودہ کا تھیلا لیکر ریلوے اسٹیشن کو چلدیا۔ اس کا بھائی کوی پرکاش بھی اس کے ساتھ آگیا۔ اس وقت دکھ اور مایوسی نے سب کی محبتیں خشک کر دیں تھیں۔ کسی کو کسی کا خیال نہیں آرہا تھا۔

اسٹیشن پر ریلوے لائن کے دونوں طرف میل بھر تک لوگ اپنے سامان کیساتھ جمع تھے۔ گاڑی کو دو بجے آنا تھا۔ لیکن ساڑھے تین بجے بھی اس کے متعلق کوئی اطلاع نہ تھی۔ انتظار کرنے والے مایوس ہو رہے تھے، کوی پرکاش نے اوب کر کہا۔ چلو بھائی

لوٹ چلیں گاڑی آج نہیں آئے گی۔

تاجور سامری بھی لوٹنے کو تیار ہو گیا تھا۔ کہ اچانک ایک شور مچ گیا۔ آگئی گاڑی۔ آگئی گاڑی۔ ہر طرف ایک ہلچل مچ گئی۔ اور رک چکی گاڑی پر ہر طرف آدمی ہی آدمی نظر آنے لگے۔ تاجور سامری اور گوی پرکاش بھی چھت پر جا بیٹھے تھے۔ شہر سے لوگ ابھی آرہے تھے۔ اب گاڑی کے ڈبے نظر نہیں آتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا انسانی جسموں کی ایک بہت بڑی اور بھاری زنجیر کلبلا رہی ہے۔

دن ڈھل گیا لیکن گاڑی نہ چلی۔ انجن بھی اسے چھوڑ کر کہیں چلدیا۔ آخر ایک پبلسٹی کی موٹر زور زور سے چیختی ہوئی آئی کہ گاڑی سے اتر آؤ۔ آج گاڑی نہیں چلے گی۔ لیکن کوئی اس کی آواز پر کان نہیں دھرتا تھا۔ موٹر پھر چنگھاڑی کہ دو منٹ میں سب شرنارتھی نیچے اتر آئیں ورنہ پولیس زبردستی سب کو نیچے اتار دے گی۔ لیکن اس دھمکی کا بھی کسی پر اثر نہ ہوا۔ صرف تاجور سامری اور گوی پرکاش پلیٹ فارم پر آگئے۔ اتنے میں پولیس کے پچاس جوان لاٹھیاں گھماتے آئے اور گاڑی سے چمٹے ہوئے لوگوں کو نوچ نوچ کر پلیٹ فارم پر رگیدنا شروع کیا۔ ڈبوں میں سے کھینچ کھینچ کر باہر نکالا۔ چھتوں سے دھکیل دھکیل کر پولیس نے نیچے گرایا۔ اس کش مکش میں بہت سے زخمی ہوئے۔ کئی چھت سے پتھریلی دھرتی پر گرے اور پھر نہ اٹھے،

دیئے جلے۔ تاجور سامری اور گوی پرکاش اپنے ڈیرے کو لوٹے۔ یہاں رام لال اور کرپا رام لاغر جھگڑ رہے تھے۔ وہ لحاف جو تاجور سامری لائلپور سے اپنی سائیکل پر لاد لایا تھا۔ اس کے لئے یہ لڑائی ہو رہی تھی، یہ لحاف دراصل رام لال ہی کا تھا۔ مگر لائلپور کیمپ میں انہوں نے بیکار سمجھ کر پھینک دیا تھا۔ تاجور سامری نے اٹھا لیا اور لے آیا، اب ڈھٹائی سے رام لال اُسے اپنی ملکیت جتا رہا تھا۔ آخر تاجور سامری نے لحاف اُن کو دیدیا تو معاملہ رفع دفع ہوا۔ تاجور سامری کو پتا چلا۔ وہ شرارجی آئینہ اور تصویروں کے

بداعتماد کہیں کے۔ اب بتایئے شیخ جی یہاں ان کو کون کھلائے جاتا تھا۔

شیخ جی کہنے لگے! اجی لعنت بھیجو ان لعینوں پر ہم تو اپنے ساتھیوں کا آخر تک ساتھ دیں گے۔ بھلے ہی.....

سردار جی بات کاٹ کر بولے آپ خاطر جمع رکھئے یہاں پنجاب کے صدیوں کے ایک ساتھ بسنے والے مسلمان ہندو سکھ ضرور ہیں لیکن گنڈا کوئی نہیں۔ انسان تو ہیں۔ درندہ کوئی نہ ہوگا۔

سردار جی کی سب نے تائید کی اور مسافروں میں پھر بھروسا پیدا ہوگیا۔ اور پھر سب کے چہروں پر اطمینان جھلکنے لگا۔

گاڑی چل پڑی۔ لیکن اب کوئی بات نہ چل سکی شیخ جی نے اپنے صافے کو ذرا چست کیا۔ اور خان صاحب نے کوٹ کی سلوٹیں درست کیں۔ اور اٹھ کر اپنے سامان کا جائزہ لینے لگے۔ سردار جی اپنا چھوٹا سا بیگ سنبھالے خاموشی سے سب کے چہروں کو پڑھنے لگے کہ ان کے دل کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ لوگ اپنے سامان کو سنبھالنے میں لگ گئے۔ اور گاڑی چلتی رہی تاجور سامری کھڑکی سے سر نکالے پیچھے کو دوڑتے ہوئے درختوں اور پاس آتے ہوئے لاہور کو دیکھ رہا تھا۔

اچانک پھر رک گئی گاڑی۔ لاہور کے عظیم الشان اور بارونق اسٹیشن پر اور مسافر اترنے لگے۔ سردار جی اور شیخ جی نے تجویز کیا کہ ہم سب کو صبح تک اکٹھے رہنا چاہیئے۔ چاہے کچھ ہو۔ تاجور سامری اور خاں صاحب نے بھی تائید کی۔ چنانچہ سب گاڑی کو چھوڑ کر پل سے مسافر خانہ کی طرف جانے لگے۔

لوگ دو قطاروں میں بٹ کر جا رہے تھے۔ ایک میں مسلمان اور دوسری میں ہندو سکھ

فریم سات روپے میں اور سائیکل بیس روپے میں ہتیائے گئے ہیں، تاجور سامری نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی ماں نے اسے اشارہ سے خاموش کر دیا ـــــــــ دوسرے دن ٹرکوں کی تلاش میں تاجور سامری اور چند اور شرنارتھی ایک سرائے میں پہنچے۔ وہاں کئی ٹرک ایک قطار میں کھڑے تھے اور ہر ٹرک کی پیشانی پر انگریزی میں لکھا تھا، شرنارتھیوں کے لئے مفت سروس، وہاں اور بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ تاجور سامری نے ایک سکھ ڈرائیور سے پوچھا۔ ٹرک کب چلیں گے، اس نے اُسے ایک طرف لیجا کر کہا۔ مفت سواری کا تو خیال ہی چھوڑ دو، اگر ہر آدمی تین روپے دینا منظور کرے تو میں اپنا ٹرک لیچلونگا!

تاجور سامری نے کہا۔ لیکن یہ ٹرک تو گورنمنٹ نے رفیوجیوں کے لئے فری مقرر کر رہے ہیں۔ اس ڈرائیور نے جھلا کر جواب دیا، تو انتظار کرو گورنمنٹ کے حکمنامے کا ـــــــــ اس طرح کام تھوڑی ہوتا ہے ـــــــــ تاجور سامری مایوس ہو کر لوٹا اور اس کے ساتھ بہت سے لوگ اور بھی۔ سبھی ان ڈرائیوروں کے ساتھ گورنمنٹ کو بھی گالیاں دے رہے تھے کہ کتنا فریب ہے، ہم سے۔ ٹرک فری سروس کے لئے مقرر کر رکھے ہیں۔ اور وصول کرتے ہیں تگنا کرایہ۔ عارضی ہسپتال والے پیپل سے دو فرلانگ پرے کئی ٹرک کھڑے تھے ان کے اردگرد ہزاروں آدمی کئی راجپوت فوجی، لوگ ٹرکوں پر ٹوٹے پڑتے تھے اور فوجی سپاہی انہیں بار بار پیچھے دھکیلتے ہوئے ڈسپلین میں رہنے کی تاکید کرتے، دو گھنٹے کی کش مکش کے بعد راجپوت صوبیدار نے لوگوں کو ٹرک میں مرغ مرغیوں کی طرح بھرنا شروع کیا۔ تاجور سامری بھی ایک ٹرک میں گھس چکا تھا۔ آج کوی پرکاش نے ماں باپ کے ساتھ رہنا طے کیا تھا اور وہ بھائی کو کھانا دیکر خود ڈیرے لوٹ گیا تھا، تاجور سامری ٹرک میں ٹھنسا بیٹھا تھا۔ باہر کے متعلق کچھ پتا نہ چلتا۔ نہ اندر کے شور کے سبب سُن سکتا، نہ کچھ دیکھ سکتا، عورت مرد، بوڑھے جوان سب ہی ایک دوسرے سے جُڑے بیٹھے تھے۔ دھوپ کی تیزی سے سب تنگ تھے لیکن کیا کرتے نہ جانے پھر یہ موقع ہاتھ لگتا یا نہیں، آخر گیارہ بجے ٹرک چل پڑے۔ اور تھوڑی دُور جاتے جاتے تاجور سامری کی آنکھ لگ گئی۔

ہزاروں انسانوں کی بھانت بھانت کی بولیوں اور لاؤڈ سپیکر کی گونجدار آوازوں کے درمیان جا کر ٹرک رک گئے، لوگ بیتابی سے سڑک پر اتر پڑے۔ یہ شریف پورہ تھا۔ امرتسر کا ایک محلہ ایک کئی منزل کی بڑے دروازے والی لمبی بلڈنگ کے بالاخانے کے چھجے سے بندھے لاؤڈ سپیکر شرنارتھی جاٹوں اور کسانوں کی ہدایتیں دے رہے تھے۔ ڈیرہ غازی خاں، جھنگ اور ملتان سے آئے کسان بھائی کرنال اور رہتک کو جائیں، لائلپور سے آئے ہوئے اپنے آبائی دیہات کو، .... اور تاجور سامری آنکھیں ملتا سڑک پر آیا۔ ماسٹر لچھمن داس نے اُسے پہچان کر کہا۔ یہ ڈاڑھی وغیرہ کی ہیئت ذرا درست کرا لو۔ کہیں ——— اپنا سر نہ جھٹکوا بیٹھنا۔ یہ کہہ کر وہ بھیڑ میں کھو گئے۔ اور تاجور سامری ایک سیدھے بازار کو چلا۔ ایک بلڈنگ کے برآمدے میں بہت سے لوگوں کا اسباب اٹھا اٹھا کر سڑک پر پھینکا جا رہا تھا۔ اور سامان والے رونی صورت بنائے ایک طرف کھڑے کہہ رہے تھے، ہم تمہارے برآمدے کو بیچ نہیں دینگے۔ رات کاٹ کر آگے چلیں گے۔ ایک موٹا سا سردار منہ سے جھاگ اور آنکھوں سے آگ برساتا ہوا، کہہ رہا تھا، تم شرنارتھی بڑے بدمعاش ہو۔ رات بھر کیلئے ٹکنے دیا تو مکان سے ہاتھ دھونے بھاگو یہاں سے ورنہ پولیس بلوا کر ہڈی پسلی ایک کرا دونگا،

ان کو چھوڑ کر تاجور سامری ایک ڈھئے ہوئے بازار میں داخل ہوا۔ بڑی بڑی عمارتیں، مسجدیں، کھنڈر بنی تھیں۔ ایک بڑی اونچی عمارت تھی۔ جس کی اب صرف چار دیواری ہی رہ گئی تھی۔ چھت اور کھڑکیاں جل چکی تھیں۔ ایک شخص کہہ رہا تھا کہ یہ مسلمانوں کا گڑھ ہے چوک فرید ہے۔ تاجور سامری وہاں رک کر اس بربادی کو دیکھنے لگا۔ اچانک ایک طرف سے چند سکھ ایک بوڑھے کو گھسیٹتے ہوئے لائے۔ بوڑھا برائے نام زندہ تھا۔ ایک سردار جی کرپان تانے اس پر برس رہے تھے۔ سالا مُسلا چھپا بیٹھا تھا اپنے مکان میں، اب چکھ مزا پاکستان بنانے کا، دوسرا بولا، اسے جھٹکا دو جی دیکھتے کیا ہو اب! ایک ادھیڑ عمر کے گرنتھی جی اپنی لمبی مالا پھیرتے ہوئے بولے، واہگورو، واہگورو، یہاں میرے سامنے مت مارو، اسے میں یہ نہیں دیکھ سکتا۔ وہاں لیجاؤ

اس ٹوٹی مسجد میں جہاں کل ایک مُسلّے کو جھٹکایا تھا۔ پہلے سردار جی نے گرنتھی جی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ بھائی جی ٹھیک کہتے ہیں۔ سڑک آگے ہی بڑی گندی ہے اسے اور خراب نہ کرو، یہ کہہ اس نے بوڑھے کو گھسیٹنا شروع کیا۔ بوڑھا سسکتے ہوئے بولا، مجھے اس طرح خراب کرکے نہ مارو، ایک دم ہی قصہ پاک کر دو۔ آہ میرے سارے عزیز یہیں مرے اب میں کہاں جاؤں گا۔ اپنے وطن کو چھوڑ کر میں نہیں جانا چاہتا۔ کرپان والے سردار جی بولے۔ تیرا وطن تو پاکستان ہے سالے۔ چل تجھے وہاں پہنچا دیں۔ یہ کہہ اُسے گھسیٹ کر وہ ٹولا پاس کی مسجد میں گھس گیا۔ تاجور سامری یہاں دبکا ایک طرف کھڑا تھا۔ اب چلی پڑا۔ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو وہی گرنتھی جی تھے۔ اس کو ٹھٹکتے ہوئے دیکھ کر وہ بولے۔ تو کون ہے رے! تاجور سامری نے گھبرا کر کہا، ہندو ہوں،

گرنتھی جی آنکھیں شکارانہ انداز میں گھما کر بولے، ہوں! ابھی پتا چل جائیگا۔ پرسوں ایک مُسلا بھی اپنے کو ہندو ہی کہتا تھا۔ یہ کہہ اس نے دُور سے ایک سکھ کو بلایا اور کہا، یہ بھی شکار معلوم ہوتا ہے۔ تاجور سامری نے موت کا بھیانک چہرہ اپنے نزدیک بڑھتا محسوس کیا۔ دوسرے سردار جی نے بغیر کچھ پوچھے تاجور سامری کو بازو سے پکڑا اور ایک طرف کرکے کہا۔ کھول تو ازار بند۔ تاجور سامری نے ڈرتے ڈرتے کھول دیا۔ تو سردار جی نے گرنتھی سے کہا۔ نہیں بھائی جی یہ تو ہندو ہے۔ گرنتھی نے کہا۔ واہگورو نے لاج رکھ لی۔ پھر کڑک کر بولا یہ کیا حال بنا رکھا ہے تو نے! کڑا پہن لے دائیں ہاتھ میں۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنے تھیلے سے ایک لوہے کا کڑا نکال کر اُسے پہنا دیا۔ اور کہا اب تو سنگھ سج گیا ہے۔ کوئی پوچھے تو اپنا نام گوروشرن سنگھ سہجدھاری کہنا۔ جا اب موج کر ——— یہ کہہ وہ دونوں آگے بڑھ گئے اور تاجور سامری وہاں سے پلٹ کر ایک اور مسخ شدہ بازار جو اب کھنڈروں کا سلسلہ رہ گیا تھا اس میں داخل ہو گیا ——— رات بھر تاجور سامری کو کہیں پناہ نہ ملی۔ دیئے جلنے تک تو وہ کھنڈروں اور خرابوں کی سیر کرتا رہا۔ جب اسے تھکاوٹ اور بھوک کا شدت سے

احساس ہوا۔ اور کچھ سردی نے بھی ہاتھ پاؤں نکالے تو وہ پاس ہی گورو رامداس کی سرائے میں پہنچا، وہاں ایک قیامت کا سا ہنگامہ مچا تھا۔ صحن اور برآمدوں میں سکھ شرنارتھی اپنے بے ترتیبی سے پھینکے سامان کے ساتھ پڑے تھے۔ کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اُڑد کی دال اور خشک چپاتیوں کی خوشبو نے تاجور سامری کی بھوک کو غیر معمولی طور پر تیز کر دیا! اور وہ تھوڑی دیر کے لئے بھول گیا کہ وہ ایک اجنبی جگہ اجنبی لوگوں میں گھرا ہے، اور وہ بے تحاشا لنگر کی طرف بڑھنے لگا، ایک سیوادار جو کمر سے چھوٹی کرپان لٹکائے ڈاڑھی کو سنوارے محض اپنی اہمیت جتانے کے لئے ادھر ادھر بیکار پھر رہے تھے، تاجور سامری کی عجیب وضع قطع کو دیکھ کر لپکے اور گردن سے پکڑ کر پیچھے کو کھینچتے ہوئے کہا، کدھر منہ اٹھائے جاتا ہے! لنگر کی طرف ننگے سر جانا منع ہے۔

تاجور سامری ٹھٹک کر رہ گیا، اسکے منہ سے بات نہ نکلی اور بار بار اسکی نظر سیوادار کی کرپان پر پڑنے لگی، سیوادار صاحب کہنے لگے! دیکھتا نہیں گورو کی سرائے ہے۔ صرف گورو کے سیوکوں کے لئے، تو جا کسی مندر یا ٹھاکر دوارے کو۔

تاجور سامری نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ خالصہ جی، میں بھی تو گورو کا سیوک ہوں، دیکھ لو یہ کڑا...... گورو شرن سنگھ نام .... سیوادار جی نے اسکی بات کو پوری بھی نہ ہونے دیتے ہوئے اُسے گردنی دیکر کہا، اُسے جا یہاں سے، یہ باتیں کسی اور سے کرنا۔ یہاں تو دن رات تجھ ایسوں سے واسطہ پڑتا ہے، آجکل ہر شرنارتھی گورو شرن سنگھ بنتا ہے۔ پرشادے جو ملتے ہیں یہاں"۔ تاجور سامری کو جیسے غلاظت میں غوطہ دے دیا گیا ہو۔ وہ ندامت اور افسوس کے بوجھ تلے دبا باہر نکلا۔ باہر سڑک پر بھی شرنارتھی اپنے سامان کیساتھ پڑے تھے، کہیں کہیں چولہے دہکتے اور کھانے پکتے بھی دکھائی دیئے۔ بھوکے بچے بلکتے ہوئے اور مجبور ماں باپ جھلاتے کڑھتے ہوئے" تاجور سامری درگیانہ مندر پہنچا، یہاں اُسے پناہ ملنے کی پوری امید تھی۔ بی بی دھنونت کور کی سرائے کا دروازہ بند تھا، اندر سے اسے بہت شور سنائی دیا معلوم ہوتا تھا ضرورت سے زیادہ مسافر بھرے ہوئے ہیں۔ درگیانہ مندر کا بڑا دروازہ بھی بند تھا، مندر میں صرف ایک قمقمہ روشن تھا۔ بھگت اور پجاری

لوگ جا چکے تھے۔ سیتلا مندر کا دروازہ بھی بند تھا۔ باہر بیشمار لوگ ادھر ادھر پڑے تھے۔ ایک ٹولہ جس کے ساتھ چند مزدور رضائیاں اور کمبل اٹھائے ہوئے تھے۔ ان لوگوں میں گھوم پھر رہا تھا۔ اس گروہ کے لیڈر ایک لالہ جی تھے جو شراب میں بدمست تھے۔ ہر شخص کو رضائی اور کمبل کے نا قابل کہتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ جہاں کہیں ان کو ایسا خاندان ملتا جس کے پاس چند جوان خوبصورت لڑکیاں ہوتیں یہ گروہ وہاں خاصی دیر رکتا اور جی بہلا کر ان میں فیاضی سے کمبل اور رضائیاں تقسیم کر کے آگے بڑھ جاتا۔ تاجور سامری کے پاس کوئی کپڑا نہ تھا مگر حالات کی صورت دیکھکر اسکو جرأت نہ ہوئی اور وہ دیوانوں کی منڈلی آخر وہاں سے چلی گئی۔

سیتلا مندر کے باہر پتھریلی کرسی پر ایک شخص مٹی کے کلھڑ میں دال اور پتل میں بہت سی روٹیاں رکھے جلدی جلدی کھا رہا تھا۔ دروازہ اندر سے کھڑکا اور اس نے جلدی سے منہ کا لقمہ نگلا ہاتھ کرتے سے صاف کئے اور روٹی اٹھا کر کھڑا ہو گیا ———— دروازہ کھلا ایک کمزور سی بڑھیا نظر آئی اس نے پوچھا آ گئے تم وہ بولا ہاں بڑی مشکل سے ایک تندور والے سے یہ روٹی دو دنی کو ملی ہے۔ دال کی چونی الگ۔ لو سنبھالو، وہ عورت روٹی لیکر اسے دعائیں اور پیسہ دیتی چلی گئی۔ وہ شخص خوشی میں بڑبڑانے لگا، چلو یہ روپیہ بھی مفت کا ہے، کھانا لنگر سے ملگیا اپنا پیٹ بھی بھرا اور روپیہ بھی اینٹھ لیا ———— یہ کہتے ہوئے اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ اٹھکر کھلے دروازے میں گھس گیا۔ تاجور سامری بھی اس کے پیچھے گیا۔ ڈیوڑھی سے بڑی مشکل سے وہ لیٹے ہوئے عورتوں مردوں اور بچوں کو پھلانگتا روندتا صحن میں گیا۔ کئی جگہ اس کی گالیوں اور ٹھوکروں سے تواضع بھی ہوئی۔ صحن میں بھیڑ ڈیوڑھی سے بھی زیادہ تھی۔ مندر کے پجاری عورتوں کے حصے میں بجلی کی روشنی میں بڑے غور سے کچھ دیکھتے ہوئے توند کا نچلا حصہ کھجاتے پھر رہے تھے۔ تاجور سامری پجاری کو بڑی زہریلی نظروں سے گھورنے لگا۔ اچانک انکو بھی اس بات کا احساس ہو گیا اور وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہاں کیا کر رہا ہے جیب کاٹنے کا ارادہ ہے؟ تاجور سامری نے گھبرا کر جواب دیا نہیں تو نہیں تو، آرام کیلئے جگہ تلاش کر رہا ہوں

پجاری جی مکاری سے غرا کر بولے۔ ارے بنتے کیوں ہو، تمہارے من کی تو تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں بھاگ جاؤ ورنہ پولیس کے حوالہ کر دونگا،

تاجور سامری نے لجاجت سے کہا۔ پجاری جی دیا کیجئے۔

پجاری نے ہونٹ کاٹ کر جواب دیا، اگر سیدھی طرح یہاں سے نہ گیا تو دیا کا اصلی روپ دکھانا ہی پڑے گا تجھ کو، کیا نام ہی ترا۔

تاجور سامری نے کہا، سادھو۔

پجاری جی نے اسکی بڑھی ہوئی ڈاڑھی، بے ترتیب سر کے بالوں اور لوہے کے کڑے کو پُراسرار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا، کیا کہنے، ہر بدمعاش اپنے آپ کو سادھو ہی کہتا ہے۔ بہروپ تو خوب بنایا ہے۔ مجھے تو اب اور ہی شک گزرنے لگا ہے، ادھر آ تو ذرا۔ پجاری جی ادھر بڑھے تو ایک ادھیڑ سی عورت نے کہا۔ پجاری جی جانے دیجئے۔ نہ جانے بچارا کتنا دکھی ہے۔

پجاری نے فوراً ہتھیار پھینکتے ہوئے کہا، اب تم کہتی ہو تو چھوڑتا ہوں ورنہ ابھی اشارے کی دیر تھی اور یہ اپنی اصلی آرامگاہ کو پہنچ جاتا ——— جا بے دیکھتا کیا ہے۔

تاجور سامری۔ مایوس ہو کر باہر آیا۔ اور دروازے کی گلی سے نکلکر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا اسے وہاں لیٹے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ اسکی آنکھیں ٹارچ کی تیزی سے چندھیا گئیں، اور ساتھ ہی ایک کھنکار کیساتھ بھاری گالی، کون ہے بے تُو۔

تاجور سامری نے اٹھ کر دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ایک مصیبت کا مارا، اب اسکی آنکھوں کی بصارت نے کام کرنا شروع کیا۔ ٹارچ والا۔ ایک سب انسپکٹر اور اسکے ساتھ دو سکھ سپاہی تھے۔

سب انسپکٹر نے پولیس والوں کے مخصوص کرخت لہجے میں کہا۔ مصیبت کا مارا تو، یہاں کاہے جیب کترا اور اٹھائی گیرا ہے، اُسے کام جو نہیں ہم کرنے دیتے، مصیبت نہ ہوں اسکے لئے۔

ایک سپاہی نے ڈانٹ کر کہا ٹھیک طرح جواب دو ورنہ وہ بھاؤ پڑیگی کہ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائیگا ——— تاجور سامری نے اب ذرا کڑے لہجے میں جواب دیا۔ یہ تمہارے

اختیار میں ہی بابا، اصلیت اتنی ہی کہ میں پاکستان سے آیا ہوں قافلے کے ساتھ کہیں پناہ نہیں ملی مجبور ہو کر یہاں آیا ہوں، اب تم لیجاؤ، یہاں سے تو بہرحال اچھی ہی جگہ ہوگی" اسکے بعد تھوڑی دیر خاموش رہی اور پولیس والوں کا رویہ کچھ نرم ہوگیا۔ سب انسپکٹر نے نرمی سے کہا۔ تم درگیانے مندر ہی میں کہیں جا کر پڑ رہو یہاں تو ہر گشت والا تنگ کریگا تمہیں۔ یہ کہہ وہ سب چلے گئے۔ اور تاجور سامری پھر مندر کے صحن میں لوٹا ایک جگہ پڑ رہا ——— سورج نکلے۔ وہ اپنی بہن کے گاؤں کو چلا، یہ گاؤں چھ ہڑپہ ریلوے اسٹیشن سے دو میل ہٹ کر گندے نالے کے پار واقع تھا۔ خالصہ کالج کے نزدیک پہنچا تو اسے ایک شخص نے بتایا کہ تم دو بجے سے پہلے سڑک پار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ آج یہاں سے ایک مسلمان کا قافلہ گزریگا۔ تاجور سامری چھ ہڑپہ کیمپ کے پاس آکر ایک پرانی عمارت کے برآمدے میں بیٹھ گیا۔ مسلمانوں کا قافلہ گزر رہا تھا عورتیں بچے مرد، تھکے اور ڈرے ہوئے، بلوچ فوجیوں کی حفاظت میں سڑک پر ہندوستانی طرف سے گورکھا اور ڈوگرا فوجی متعین تھے۔ بلوچ سپاہی تعداد میں تھوڑے تھے اسلئے اکثر تین تین فرلانگ کا فاصلہ بے محافظ ہی لوگوں کو گزرنا پڑ رہا تھا۔ تاجور سامری کے سامنے ایک ڈوگرا حوالدار اور دو سپاہی رائفلیں لئے کھڑے تھے اچانک دو تین شخص سر منہ لپیٹے انکے پاس آئے اور کچھ اشارے ہوئے۔ ڈوگرا فوجیوں نے دور تک میدان صاف دیکھ کر اشارہ کیا۔ اور ان آدمیوں نے دو جوان مسلمان لڑکیوں کو اٹھایا اور پاس کے ہندو شرنارتھیوں کے کیمپ میں گھس گئے۔ ڈوگرا حوالدار نے فائر کا حکم دیا اور سپاہیوں نے ہوا میں گولیاں چلائیں ہر طرف ایک بھگدڑ مچ گئی قافلے کا وہ حصہ جس سے لڑکیاں اغوا کی گئیں تھیں اس بلڑ میں بکھر کر آگے نکل گیا۔ اور تھوڑی دیر میں حالات معمول پر آگئے ——— بھوکا اور تھکا ہارا تاجور سامری دن ڈھلنے سے کچھ دیر پہلے اپنی بہن کے گھر پہنچا۔ اس کے بوڑھے بہنوئی اور بہن نے اسے گلے سے لگایا آس پاس کے لوگوں نے آکر اسکی اور اسکے ماں باپ بھائی اور بھانجی لبھی کی خیریت پوچھی۔ تھوڑی دیر کے لئے تاجور سامری کی تھکاوٹ اور بھوک اس گرمجوشی نے مٹا دی اسکے بعد وہ اندر گیا۔ تو کمرے میں وہ بستر جو اسکی ماں لائلپور سے سامان کیساتھ یہاں ۶ اگست کو چھوڑ گئی تھی کھلا ہوا پڑا تھا۔ بہن سے پوچھا، تو اسنے جواب دیا۔ بابو رام آیا تھا وہ چند دن یہاں رہکر اپنا سامان لیگیا ہے کہتا تھا اس بستر میں بھی میرا بھی کچھ سامان ہے تاجور سامری کا ماتھا ٹھنکا لیکن اسوقت چپکا ہو رہا۔ اس کے آدھ گھنٹہ

بور اسکے ماں باپ بھائی کوی پرکاش اور بہنیں بھی آگئے۔ وہ سب تھکے ہوئے اور نڈھال تھے۔ تاجور سامری کی
اور بخار کے مارے بے حال تھی اچانک اسکی نظر کھلے ہوئے بستر پر جا پڑی اور گھبرا کر بولی۔ بھاگونتی یہ کیا؟
ملا جو تاجور سامری کو ملا تھا۔ اسنے گھبرا کر فوراً ٹرنک مٹی کی الماری سے باہر نکالا تو وہ سر پیٹ کر رہ گئی۔ ٹرنک کا تالا
ٹوٹا ہوا تھا۔ کھولا تو اسمیں سے زیور اور روپے کا بکس غائب ریشمی کپڑے گم۔ بستر میں کام کے کپڑے نظر نہ آئے۔ اس پر ہر طرف
افسردگی کا عالم چھا گیا۔ تاجور سامری کی ماں باپ اسوقت دوسری لڑکی کے پاس جانیکو تیار ہو گئے جسکے دیور نے
یہ ستم ڈھایا تھا اور سب کے روکنے کے باوجود دونوں چلے گئے۔ تاجور سامری کی آنکھوں کے تلے اندھیرا چھا گیا۔ کوٹھے پر چڑھ
کر اپنے بوڑھے اور مصیبت کے مارے ماں باپ کو اندھیرے میں گم ہوتے دیکھنے لگا۔ اسکو اپنے امیدوں کے محل گرتے
آئے، جو پاکستان سے آتے ہوئے اسنے آزاد ہند کی دھرتی پر تعمیر کئے تھے، مایوسی گہری ہوتی جا رہی تھی کہ اچانک
میں سفیدی جھلکنے لگی۔ نور کی لہریں پھیلنے لگیں۔ یہ پھیلتی ہوئی لہریں اب بیج کی لہریں بن گئیں۔ بہتے ہوئے
دریا کی طرح لہریں جس میں ایک کالی سی چیز حرکت کر رہی تھی۔ تاجور سامری نے تصور کی آنکھ سے غور سے
دیکھا تو یہ وہ ہی بھینس تھی جو بیو کی ہیڈ پر دریا میں لہروں سے زندگی کیلئے مقابلہ کر رہی تھی دو
طرف اونچے کچے ڈھلوان کنارے سامنے پل کے مہیب دروازے جن سے پانی بھیانک روپ میں
تھا اور پیچھے دور تک پانی ــــــ لیکن وہ بھینس پھر بھی زندگی اور امید کے لئے مشکلوں اور رکا
سے لڑ رہی تھی۔ تاجور سامری نے اور غور سے اسے دیکھا منظر ایک جادو کے نظارے کی طرح۔ دھیرے
دھیرے رنگ بدلنے لگا۔ اب وہ دریا اور پھیل گیا۔ اور اس میں بیشمار جسم حرکت کرتے نظر آئے
اور دھاروں کے خلاف لڑتے ہوئے دھند لکا چھٹنے لگا۔ نور پھیلنے لگا۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا
ان مجاہدوں نے سب مشکلوں پر قابو پا لیا ہے ــــــ مشکلوں اور رکاوٹوں کے خوفناک مرحلے
ہو گئے ہیں۔ تاجور سامری کو اس دھندلکے میں امید کا خوشنما دیا صاف اور قریب نظر
لگا۔

۱۰ر نومبر ۱۹۴۸ء

جالندھر

KUTUB KHANA ANJUMAN TARAQQI-E-URDU (HIND) * ALIGARH *
کتب خانہ
انجمن ترقی اردو
(ہند)
علیگڑھ

ایک ہی جگہ جانے کے لئے ایک ہی راستے میں یہ تضاد۔ تاجور سامری خاں صاحب سردار جی اور شیخ جی چاروں ہندو و سکھوں کی قطار میں جا رہے تھے اور دونوں قطاروں کے بیچ تیسری قطار تھی پولیس کے جوانوں کی ان میں مسلمان زیادہ تھے۔ اچانک مولوی صاحب نے خانصاحب کو غلط جگہ دیکھا۔ مذہبی حمیت کی رگ پھڑک اٹھی۔ چلّا اٹھے غدّار!

خاں صاحب۔ جواب میں پکارے! ڈرپوک۔

مولوی صاحب کے ایک ساتھی نے کہا۔ ارے خدا سے ڈرو! آجاؤ میاں!

خانصاحب اور شیخ جی خاموش رہے۔ اس نے ایک سپاہی سے کہا۔ وہ دیکھئے سنتری جی ہندوؤں میں مسلمان! سپاہی یہ سنکر اُدھر لپکا۔

شیخ جی ڈانٹ کر بولے۔ کیوں بڑھا آتا ہے اِدھر؟

سپاہی نے کہا۔ تم مسلمان ہو!

خانصاحب بولے۔ نہیں انسان۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ اور سب آگے بڑھ گئے۔

اب یہ لوگ اس وسیع مسافر خانے میں پل کی سیڑھیاں اتر رہے تھے جہاں آج سو دو دن پہلے کوئی تخصیص یا امتیاز مسافروں میں نہیں برتا جاتا تھا لیکن آج یہاں دو دھڑے دو کیمپ نظر آ رہے تھے۔ بیچ میں پُل کی سیڑھیوں سے ٹکٹ گھر کی کھڑکی والی دیوار تک ایک کھلی سڑک سی چلی گئی تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے کیمپوں کی حد کا تعین کرتی تھی۔ اس سڑک پر پولیس کے جوان رائفلیں کندھوں پر ڈالے گھوم رہے تھے۔ امن اور قانون کی حفاظت کرتے ہوئے بلکہ امن سے زیادہ انہیں قانون اور اپنے انگریز اور انگریز زدہ افسروں کا حکم عزیز تھا چنانچہ وہ اُسے پوری وفاداری سے بجا لا رہے تھے۔ قانون نے یہ طے کر دیا تھا کہ ہندو اور مسلم دو الگ الگ قومیں الگ الگ تمدن ہیں۔ ان کی علیحدگی کو برقرار رکھنا ہی قانون کی حفاظت

ہی۔ چنانچہ وہ اس قانون کی حفاظت پوری مستعدی اور تندہی سے کر رہے تھے۔ سپاہی مسافروں کو شروع ہی میں اُن کے لباس اور وضع قطع سے ہندو اور مسلمان فرض کر کے الگ الگ دھڑوں میں بانٹ دیا جاتا۔ چاہے اس میں صاف زیادتی ہی کیوں نہ ہو۔ تاجور سامری نے دیکھا کہ میانوالی ضلع کے دو مسافر ہندو کیمپ میں آنا چاہتے تھے لیکن سپاہی انہیں مسلمان بنانے پر تلا بیٹھا تھا۔ اور انہیں اُدھر ہی دھکیل رہا تھا۔ یو۔ پی کے ایک میر صاحب اپنے ہندوانہ لباس کے کارن ہندو دھڑے میں پڑے تھے۔ اور اپنے لوگوں میں جانے کے لیے بے تاب تھے۔ خانصاحب شیخ جی، سردار جی اور تاجور سامری بیچ کی سڑک سے ہوتے ہوئے سیدھے دیوار کے پاس جا پہنچے۔ اور اپنا سامان زمین پر ڈال کر بیٹھ گئے۔ دونوں کیمپوں کے لوگ ان عجیب و غریب مسافروں کی اس عجیب حرکت سے حیران ہو رہے تھے۔ شاید یہ سمجھ رہے تھے کہ اس زمانے میں جب پنجاب میں فساد کے طوفان کا بند ٹوٹ گیا ہے ہندو مسلمان اور سکھ کیوں اکٹھے بیٹھے ہیں۔ جیسے ان کو اس حادثے کا علم ہی نہیں یا وہ ہندو اور مسلمانوں کو اتنا سرد سمجھتے ہیں کہ ان کی رگ حمیت اس ڈھٹائی سے پھڑک نہ اٹھے گی۔

تاجور سامری نے دیکھا کہ مولوی صاحب کچھ ہی دور بیٹھے انہیں اکٹھے اور مطمئن دیکھ کباب ہو رہے ہیں۔ اس نے خانصاحب کو ذرا ٹہوکا دیکر یہ منظر دکھایا۔ شیخ جی بھی چونکے اور اپنے مخالف کو دیکھ کر کہا۔

اجی لعنت بھیجو اُس کمینے پر ——— اتنے میں ایک مسلمان سپاہی مولوی صاحب کے پاس سے گزرا تو انہوں نے اُسے پاس بلا کر ان دوستوں کی طرف اشارہ کر کے کچھ سمجھایا۔ سردار جی بولے ایلو حملہ شروع ہو گیا۔

شیخ جی نے گھبرا کر کہا، کہاں ؟

سردار جی مسکرا کر بولے۔ وہ دیکھئے ہمارے مولوی صاحب سپاہی سے کچھ ساز باز کر رہے ہیں۔ اب کوئی گُل کھلا سمجھو۔

چنانچہ یہی ہوا۔ سپاہی تیزی سے آکر خاں صاحب کو ڈانٹنے کے انداز میں کہنے لگا۔ تمہیں علم نہیں کہ آج کرفیو لگا ہوا ہے۔

خاں صاحب نے اُس انداز میں جواب دیا۔ مسافر خانے میں کب سے لگا ہے۔ میاں قانون کے تو تم بڑے عالم معلوم ہوتے ہو۔

سپاہی کھسیانا ہو کر بولا۔ خیر میرا مطلب یہ تھا آپ اپنے لوگوں میں بیٹھئے۔ یہ جگہ خطرناک ہے۔

شیخ جی بولے۔ میاں جاؤ اپنا کام کرو۔ ہم اپنے ہی آدمیوں میں بیٹھے ہیں۔ تم ہماری فکر سے کیوں دُبلے ہوئے جاتے ہو؟

سپاہی یہ سُن کر ایک طرف ہو گیا مولوی صاحب جو اس انتظار میں تھے کہ ابھی ان چاروں دوستوں کو الگ الگ کر دیا جائے گا۔ اپنی غیر متوقع شکست پر کچھ کر رہ گئے اور آنکھ بھر کر تسبیح پھیرنے لگے۔

شیخ جی جھلا کر بولے۔ مکار کہیں کا۔ دوزخ میں جائے کمبخت۔ خدا اور رسُول کے نام پر کتنا فریب ہو رہا ہے۔

خانصاحب نے کہا۔ میں تو کہتا ہوں شیخ جی یہ مذہب وغیرہ ہیں ہی دھوکہ کی بنیاد۔

سردار جی نے سنجیدگی سے کہا۔ خاں صاحب اب یہاں کوئی بحث نہ چھیڑیئے وقت نازک ہے۔ دیکھئے نہیں آپ بیٹھے کہاں ہیں ہم۔

خانصاحب یہ سنکر خاموش ہو کر پُل سے اُترتے ہوئے مسافروں کو دیکھنے لگے۔

تاجور سامری کی آنکھیں تو جیسے سارے مسافر خانے میں گھوم رہی تھیں کا تنہ میں اچانک سامنے سے شور اٹھا ایک مسلمان قلی تھا جو ایک ہندو کا ٹرنک اٹھائے تھا اور چند مسلمان اُسے اس حرکت پر نفرین کر رہے تھے۔ مولوی صاحب وہاں پہنچے ہوئے تھے اور فتویٰ صادر کر رہے تھے کہ ہندو کا سامان اٹھانیوالا قلی۔ کافر ہوگیا۔ مُرتد ہوچکا۔ اس کا قصور قابل معافی ہی نہیں سب اسکے گرد ہو رہے تھے۔ آخر قلی نے تنگ آکر کہا۔

صاحب آپ کی مسلمانی آپ کو مبارک میں مزدور ٹھہرا۔ مجھے سب کی خدمت کرنی ہے مجھے پیسہ چاہیئے۔ چاہے ہندو سے ملے چاہے مسلمان سے۔ اس سے غرض نہیں۔

یہ کہہ کر وہ اس ہندو مُسافر کا سامان وہیں ہندو دھڑے کے ایک طرف آہستہ سے رکھ کر مزدوری لیکر چلدیا۔ ہندوؤں میں اس کا ردِ عمل پیدا ہوگیا، اور لالہ لوگ اس کو نوچنے لگے۔ کہ تم کو ہندو قلی نہیں ملتا تھا جو ایک ملیچھ کو پیسے دیئے۔ وہ بچارا حیران سر ایک طرف ڈالکر بیٹھ گیا۔ دونوں کیمپوں میں اس واقعہ سے کچھ گرمی سی آگئی۔ مسافر اب مسافر نہیں ہندو اور مسلمان اور سکھ بن چکے تھے۔ اور اپنے مخالفوں کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ دونوں کیمپوں میں فساد کے واقعات اور اس کی وجہ کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔ ہر فرقہ دوسرے فرقہ کو الزام دے رہا تھا اور اپنے نزدیک اُسے قابلِ گردن زدنی سمجھ رہا تھا۔ مسافر خانے کے باہر کے احاطے میں تانگے والے رکشا والے اور چھابے والے نظر آرہے تھے۔ لیکن یہ تقسیم ان میں نہیں نظر آتی تھی۔ ہندو مسلمان اور سکھ تانگے والے پاس پاس کھڑے دن نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک ان کیمپوں کی سرحد کی سٹیج پر دو نئے ایکٹر نمودار ہوئے۔ یہ ایک لاہوری تانگے والا تھا کالی سی گول ٹوپی اور پاجامہ اور کوٹ پہنے اس کی بڑی بڑی سُرخ چمکتی ہوئی آنکھوں سے گنڈا پن جھلک رہا تھا۔ دوسرا کوئی باہر کا ہندو مسافر تھا۔ تانگے والا کہہ رہا تھا۔ شاہ جی

آپ چاہے کچھ بھی نہ دیجئے۔ ہمیں آدمیوں کے منہ لگنا ہے روپے پیسے کے نہیں۔ تانگہ آپ کا ہے جہاں کہئے پہنچا دوں گا۔ لالہ جی نے کہا یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ پیسے پہلے اور باتیں بعد میں تم پیسے کی بات کرو۔ کیا لوگے گوال منڈی کا۔

تانگے والا گوال منڈی کا نام سُنکر قدرے جھجکا۔ اچانک پیچھے سے آواز آئی۔ بخشو، ارے بخشو۔ تانگہ والے نے پیچھے کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر اس کا چھپا ہوا راز آگیا ہندو مسافر یہ دیکھ کر گھبرا کر ہندو کیمپ میں گھس گیا۔ اور تانگے والا ایک ایسے شکاری کی طرح جس کے ہاتھ سے شکار اچانک چھوٹ جائے۔ مسلمانوں کے ہجوم میں گم ہو گیا۔

شیخ جی نے اُداس لہجے میں کہا۔ دیکھ رہے ہیں خانصاحب! ایمان کا کس طرح بیڑا غرق ہو رہا ہے۔ حضرت رسولؐ اور اسلام ..... کے یہ نام لیوا اس درس کی مٹی کس طرح خراب کر رہے ہیں۔

خانصاحب دُکھ کی شدّت سے بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ کمبخت دن ہی نکلنے میں نہیں آتا اس ماحول میں تو میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ کم بخت تعصّب انسانیت کو نگلتا چلا جا رہا ہے۔ کاش میں اپنے گاؤں ہی سے نہ آتا۔

شیخ جی بولے میں خود گھبرا گیا ہوں، یہاں آکر اس مسموم فضا سے میرا لڑکا کیونکر محفوظ رہا ہوگا؟ میں اُسے سمجھا سمجھا کر ہار گیا۔ مگر وہ شہر کی رہائش سے باز نہ آیا اب تو وہ بھی انہی کا سا ہو گیا ہوگا۔ یہ کہتے ہوئے شیخ جی کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے خانصاحب بھی پسیج گئے اور کہنے لگے اب قیامت کے نزدیک ہونیکا یقین ہو گیا ہے۔ اب یقیناً کچھ نہ کچھ ہو کر رہیگا۔ آثار بُرے نظر آتے ہیں۔ آہ بدقسمت ہندوستان ..... یہ کہتے ہوئے ان کا گلا بھر آیا تھا۔ سرد رجی کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

گرفیو کا وقت ختم ہوتے ہی لوگ جلدی جلدی مسافر خانے سے نکلنے لگے۔ جیسے کانجی ہاؤس سے ہفتوں کے قیدی مویشی۔ یا باڑے سے رات بھر کی بند بھیڑ بکریاں ——— بھیڑ بکریاں؟ ہاں یہ سب بھیڑ بکری ہی تو ہیں، جن کو یہ چالاک گڈریا انگریز اپنی مرضی سے جدھر چاہتا ہی ہنکا لے جاتا ہی۔

تانگے رکشا اور ٹیکسی حرکت میں آچکی تھیں۔ لوگ ان پر ٹوٹے پڑتے تھے اور اُدھر اُن کی چاندی تھی۔ سواری کی کثرت دیکھ کر رکشا۔ ٹانگوں والوں نے بھی نرخ بڑھا دیئے۔ اکنی کا روپیہ کر دیا۔ اُس پر طرہ یہ کہ ہندو تانگے والے مسلمان مسافروں کو اپنے تانگے میں نہیں بٹھاتے تھے اور مسلمان ہندو سے بات کرنا گناہ سمجھ رہے تھے۔ ہندو تانگہ بان اور رکشا کھینچنے والے یوں بھی کم گنتی میں تھے اس لئے پریشان بھی ہندو ہی ہو رہے تھے زیادہ

سردار جی نے ایک ہندو تانگے والے سے پوچھا۔ گوال منڈی چلو گے؟

تانگے والا "کیوں نہیں۔ سالم چاہیئے؟"

سردار جی بولے ہاں سالم۔ میرے یہ ساتھی بھی چلیں گے۔ راستے ہی میں اُتر جانا ہی انہیں

تانگے والا کانوں پر ہاتھ رکھکر بولا "نا بابا۔ مجھے تو برادری والے تباہ کر دیں گے۔ میں بھلا مسلمانوں کو اپنے تانگے میں کیوں بٹھانے لگا۔ یہ کہہ کر وہ ان کو چھوڑ کر ایک موٹے لالہ جی سے بات کرنے لگا۔ تاجور سامری نے جھلا کر کہا۔ چھوڑیئے خاں صاحب ان منافقوں کو۔ ہم پیدل چلیں گے۔ کوئی نہیں ہم کو کھائے جاتا۔ اس کی تینوں نے تائید کی اور چل پڑے پیدل ہی۔ بیشمار لوگ جا رہے تھے لیکن ایک خوفناک اور بے اطمینانی کا عالم سب کے چہروں پر چھایا تھا۔ ہر شخص رہ رہ کر آگے پیچھے خوفزدہ نگاہوں سے دیکھتا۔ ہر کسی کو ہر جگہ سے خطرے کا بھیانک رُوپ جھلکتا دکھائی دیتا تھا۔ بند دکانیں اور خاموش اونچی اونچی عمارتیں

جن سے اب گزرنے والے مسافروں کی آوازیں اور تانگے موٹروں کا شور ٹکرا رہا تھا۔ اپنی ہیئت پر قائم رہنے کی پابند معلوم ہوتی تھی۔ ایک خوفناک ایک ویرانی ایک چپ کی چھاپ سب پر لگی تھی۔ پولیس رائفلیں کندھوں پر ڈالے اپنی ڈیوٹی پر موجود تھی اور مسافر اب بھی ہندو مسلمان کیمپ میں بٹ کر ایک ہی راہ پر تقریباً ایک ہی منزل پر ایک دوسرے سے کٹتے ہوئے سے چلے جا رہے تھے۔ ہر شخص کی آنکھوں سے انتقام دہشت اور پُراسرار چمک پھوٹ رہی تھی۔

یہ چاروں ساتھی بیفکری سے باتیں کرتے جا رہے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اچانک چوک دال گراں میں آکر سب رُکے۔

شیخ جی نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ دوستو اب مجھے اجازت دو۔ مجھے سلطان کی سرائے کی طرف جانا ہے۔ زندگی ہوگی تو پھر ملیں گے ——— خدا آپ کی حفاظت کرے

خاں صاحب بولے "مجھے بھی ادھر ہی کو جانا ہے پیارے ساتھیو" مجھے بھی رخصت چاہیئے آپ سے جُدا ہونے کو جی نہیں چاہتا لیکن جُدائی ایک ایسی سچائی ہے جسکو جھٹلانا ناممکن ہے۔

تاجور سامری اور سردار جی ان سے گلے ملے۔ اور گہرے دوستوں کی طرح جُدا ہوئے سردار جی دیر تک مسجد کے پاس کھڑے ان دونوں کو بھیڑ اور دُوری میں گم ہوتے دیکھتے رہے جب ادھر سے نا اُمید ہو گئے تو کھوئے کھوئے سے انداز سے کہنے لگے۔ کتنے اچھے دوست تھے اور کتنے سچے انسان! کیا زندگی میں ہم پھر بھی مل سکیں گے کبھی؟

تاجور سامری نے کہا۔ یقیناً سردار جی زندگی چاہیئے۔ یار زندہ صحبت باقی۔ لیکن اب یہ بتایئے کہ آپ نے کیا طے کیا ہے؟ یہ سڑک بھی گوال منڈی چوک میں جا ملتی ہے۔ آپ پیدل جائیں گے یا تانگے سے! راستہ دونوں طرف سے خطرناک ہے۔

سردار جی نے کہا۔ تانگہ ملجائے تو کیا کہنے پھر تو میں اور آپ شاہ عالمی تک اکٹھے جا سکتے ہیں

تاجور سامری۔ پھر پکڑیئے کوئی تانگہ۔ یہاں رُکنا خدشے سے خالی نہیں۔

سردار جی۔ تانگے تو بہتیرے گزر رہے ہیں لیکن کسی تک ہاتھ بھی پہنچے۔ پکڑ دں کیونکر؟

تاجور سامری۔ تو پھر خُدا کے بھروسہ پیدل ہی چلیئے۔

سردار جی۔ یہ الفاظ صرف کہنے تک خوب صورت معلوم ہوتے ہیں۔ عملی دنیا میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ پھر میرا تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ خطرہ تو مجھ اشتہاری پر فرلانگ سے لپکیگا۔ اور پھر گزرنا بھی ایسے علاقوں سے ہے۔ جو چھُرے بازی اور قتل و غارتگری کے لئے مشہور ہیں۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک پُوربیا خالی تانگہ لئے گزرا۔ تاجور سامری نے آواز دی اور وہ رُک گیا۔ کہاں چلیئے گا! بابُو جی تانگے والا بولا۔

سردار جی۔ گوال منڈی۔ کیا لوگے؟

تانگے والا۔ دو رُوپے۔

تاجور سامری۔ یہ تو بہت زیادہ ہیں بھیا۔ آٹھ آنے لے لینا۔ آؤ ہندو بھائی ہو کچھ تو لحاظ کرو۔

تانگے والا۔ بابُو جی۔ آجکل یہ باتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ دو رُوپے سے کم مسلمانوں کے علاقوں سے آپ کو لیکر جانا میرے لئے تو مشکل ہے۔ آپ کو منظور ہوں دو رُوپے تو آجایئے۔"

سردار جی جھلا کر بولے جاؤ بھئی ہم باز آئے سواری سے ——— تانگہ والا یہ سنکر تیزی سے چلدیا ——— اور پھر پیدل چلنے لگے۔ سرکلر روڈ پر لوگ بہت تیزی سے چلے جا رہے تھے۔ دکانیں ابھی تک بند تھیں۔ جب یہ دونوں موچی دروازے کے نزدیک پہنچے تو ایک طرف مسلمان مزدوروں کی ایک بھیڑ نظر آئی۔ سردار جی تو ایسے سہمے گویا موت

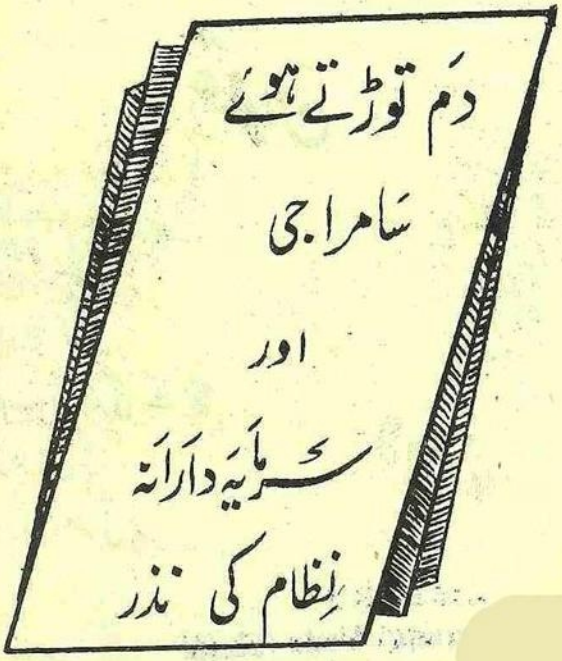

تاجور سامری پرنٹر پبلشر نے فاروقی پریس دہلی میں چھپوا کر ادبی مندر پبلشرز سے شائع کی

کے منہ میں آگئے ہوں تاجور سامری نے کہا "سردار صاحب آپ تو جی چھوڑ چلے ہیں۔ اس طرح تو خطرہ نہ ہونے پر بھی پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ اپنے دھیان چپکے سے چلے آیئے۔ چنانچہ یہ دونوں برابر برابر بڑی متانت سے چلنے لگے ——— خیر گزری کہ یہ مرحلہ جلدی ہی طے ہو گیا۔ اب شاہ عالمی کا علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ خالص ہندو آبادی دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ چوک میں پولیس ڈیرے ڈالے پڑی تھی۔ امرت سری ہندو ہوٹل۔ ایک کھنڈر کی طرح خاموش اور سُونا نظر آرہا تھا یہاں آکر سردار جی کو ایک گوال منڈی کا ساتھی مل گیا۔ اور اب تاجور سامری رتن چند روڈ کی طرف سے رتن چند تالاب کے بڑے آہنی دروازے کی طرف چلا ——— اس دروازے کے آگے بھی چند پولیس کے سپاہی رائفلیں تھامے کھڑے تھے۔ اور بانسوں کی اُجڑی اجڑی دکانیں اپنی بیتی خاموشی کی زبان سے سنا رہی تھیں۔ ایک طرف ایک ٹوٹا ہوا۔ ٹھیلہ پڑا تھا۔ جس کے ایک طرف مرا ہوا گھوڑا اور خُون میں لت پت مسلمان کی لاش تھی۔ معلوم ہوتا تھا ابھی ٹھنڈی ہوئی ہے۔ گھوڑے کے پیٹ میں برچھی کی ٹوٹی انی گھسی ہوئی نظر آرہی تھی۔ جو شاید جلدی میں کمزور دستے کو چھوڑ کر گھوڑے کے پیٹ میں رہ گئی۔

سپاہی ہندو تھے اس لئے وہ خوش تھے کہ آخر ہندو بھی مردوں کا سا کام کرنے لگ گئے ہیں۔ ان باتوں سے جان پڑتا تھا کہ قاتل اپنا کام اطمینان سے ختم کر کے سامنے کی گلی میں گھس چکا ہے۔ اور وہ تہذیب کا کارنامہ بازار میں پڑا تھا۔

تاجور سامری گھبرا کر اُس آہنی دروازے کو پار کر گیا۔ مندر میں آرتی ہو رہی تھی گھنٹے۔ گھڑیال اور سنکھ کی آوازیں اور بھگتوں کے بھجنوں سے فضا گونج رہی تھی۔ شاید یہ فرض اس وقت بھی جاری تھا۔ جب باہر ایک مسلمان ٹھیلے والا اور اس کا ساتھی گھوڑا، دونوں قتل کر دیئے گئے تھے ——— وہ تڑپ رہے تھے۔ مسلمان نزع کی حالت

میں شاید پانی مانگ رہا تھا۔ اور اُدھر یہ آرتی کا شور اسکی اس ناپاک آواز کو دبا رہا تھا سپاہی مسکرا رہے تھے۔ اور قاتل کے صاف بچ جانے پر خوش تھے۔ تاجور سامری اپنے خیالوں کی ادھیڑ بُن میں تالاب کے پختہ کنارے سے ہوتا ہوا سمادھوں کے نزدیک پہنچ گیا۔ جہاں اسکے چھوٹے بھائی کوی پرکاش کی کوٹھڑی تھی۔ کوی پرکاش یہاں تعلیم کے سلسلے میں رہتا تھا۔ یہ جگہ دیوان کرشن کشور نے ایسے ہی ودیارتھیوں کے لئے بنوائی تھی۔ ساتھ ہی مندر اور لنگر بھی۔ تاکہ ودیارتھی پڑھنے اور پوجا پاٹھ کرنے کے بعد پیٹ بھی بھر سکیں۔ دیوان صاحب خاندانی امیر اور دانی تھے۔ دیوان رتن چند اڑھی والے کے پوتے۔ ان کو دان سے زیادہ اپنی دیوانی زیادہ پیاری تھی۔ اور دیوانی کو قائم رکھنے کے لئے وہ دان کرتے تھے۔ لاکھوں کماتے تھے اور سینکڑوں دان کرتے تھے۔

آرتی ختم ہوئی گھنٹے۔ گھڑیال اور سنکھ اپنا فرض بجالا کر خاموش ہوئے اور ودیارتھی سمادھوں کی طرف اپنی کوٹھڑیوں کو آنے شروع ہوئے۔

تاجور سامری تالاب کے گھاٹ سے ملحق چبوترے پر کبوتروں کی محفل کے نظارے میں کھویا ہوا تھا۔ یہ کبوتر اُس جگہ کے مستقل باسی تھے۔ اور ماحول سے مانوس۔ بھگت لوگ کی شردھا سے ہر صبح ڈالی جانیوالی مونگ، چنے کی دال پر ان کی گزر اوقات ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ شاید بڑے دیوان کے وقت سے چلا آرہا تھا۔ کیونکہ کبوتر گھڑیالوں کے شور کے باوجود یہیں بیٹھے رہتے تھے یا اڑ کر منڈیروں پر جا بیٹھتے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا تھا آج کوئی بھگت نہیں آیا تھا کیونکہ یہ منتظر تھے ہر روز کی طرح.....

اچانک کوی پرکاش نے پاس آکر تاجور سامری کو پرنام کیا وہ چونکا اور آشرباد دیتے ہوئے کہا اچھے تو ہو نا! کوی نے ہاں کہہ کر فوراً کہا۔ "آپ خواہ مخواہ یہاں

آئے، میں تو خود لائل پور جانے ہی کو تھا۔ فساد کی آگ نہ جانے کب تک بھڑکے۔ یہاں تو رات دن حملے کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں۔ نہ رات کو نیند نہ دن کو چین، سامنے کے پہاڑی لوگ تو کوارٹر پہلے ہی دن چھوڑ اپنے گھروں کو بھاگ گئے۔ دو دیار تھی بھی جا رہے ہیں۔ اب یہ اتنی بڑی جگہ تو ویرانی کے کارن ڈراونی ہو گئی ہے۔ اس پر حملہ آوروں کی دہشت۔

کیا دیوان صاحب بھی کوئی انتظام نہیں کرتے۔" تاجور سامری نے سب دو دیار تھیوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

بدھی چند ربولا۔ دیوان جی تو کئی دنوں سے نظر ہی نہیں آئے۔ کوٹھی پر ملنا نہیں ہو سکتا۔ آگے مندر روز صبح کو آتے تھے جب سے فساد کا زور ہوا ہے یہاں بھی آنا چھوڑ دیا انہوں نے۔

امرناتھ نے جھلا کر کہا وہ کر چکے انتظام۔ ان کو روپے اور شہرت کی فکر کسی وقت چھوڑتے تب نا! اور اب تو خود ان کی جان خطرے میں ہے۔ وہ اپنا انتظام کریں یا تمہارا بدھی چند"۔ اور کنجوس اتنے کہ کیا کوئی ہوگا۔ یہاں آتے ہیں تو آٹے دال کا تولے تولے کا حساب پوچھتے ہیں۔ وہ ہماری حفاظت کا انتظام کیا کرینگے"۔

اسی بیچ میں سادھوں کے سکھ چوکیدار نے بھی آ فتح بلائی۔

" سری واہگورو جی کا خالصہ سری واہگورو جی کی فتح۔ کہو پنڈت جی صبح صبح کیسے آ گئے، کیا موٹر سے آ رہے ہیں۔ آپ؟"

اجی کہاں، رات بھر اسٹیشن پر خراب ہوا کیا ہوں۔ اب کہیں آ سکا ہوں۔ تاجور سامری نے رات کی تکالیف کے احساس سے تنگ سا آ کر کہا،

کوی پرکاش نے حیران ہو کر کہا۔ آپ نے رات سٹیشن پر گزاری، میں سمجھا تھا،

کہ سے گاڑی ہی اب پہنچی ہوگی۔ پھر تو آپ کو آرام کرنا چاہیئے۔ یہ کہ کر اس نے اپنی کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا۔

تاجور سامری "آرام تو ضرور کرونگا۔ لیکن ابھی نہیں رات سے بھوکا ہوں پہلے کچھ کھانے کو ملنا چاہیئے۔

بدھی چندر نے کہا "میری کوٹھڑی میں تھوڑی سی مٹھائی پڑی ہوئی ہے آؤ کوی! کوی پرکاش لپک کر تالاب کے دوسرے سرے پر جا پہنچا۔ اور کوٹھی کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔

چوکیدار نے داڑھی اور مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا راستے میں کوئی خطرہ تو نہیں تھا۔

بدھی چندر بولا "خاصے رہے۔ اگر خطرہ ہوتا تو یہ یہاں کیسے آسکتے تھے؟

سردار جی کھسیا کر سمادھوں کے صحن میں گھس گئے۔ کوی پرکاش نے مٹھائی کا دونا لاکر تاجور سامری کو دے دیا۔ اور وہ کھڑے کھڑے اسے کھانے لگا۔ کوی پرکاش نے کہا۔ امر ناتھ جی اکثر مجھے ملتے رہے ہیں۔ لیکن اب دو دنوں سے نہیں ملے۔ آپ کے متعلق پوچھتے تھے کب آئیں گے۔ ہو آیئے گا ذرا ان کے ہاں ——— تاجور سامری بولا۔ دوپہر کے بعد جاؤں گا۔ پہلے میرا ارادہ تھا اُدھر ہی جاؤں ایک گوالمنڈی کے سردار جی بھی ادھر جا رہے تھے لیکن یہاں آکر ارادہ ترک کر دیا۔

کوی پرکاش نے کہا۔ اچھا کیا آپ نے آجکل سکھوں کو تو بہت زیادہ خطرہ ہے۔ ہندو تو خیر دیر میں پہچانا جاتا ہے۔ سکھ کے لئے چھپنا ناممکن ہے۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک سفید ریش بوڑھا صحن میں آگرا۔ سب و دیار تھی

چونک اٹھے۔ چوکیدار "دیوان جی آگئے" کہ کر ادھر لپکا۔

کوی پرکاش نے کہا۔ دیوان کرشن کشور ہیں۔ اس تالاب کے مالک آئیے وہاں چلیں دیکھئے کیا کہتے ہیں وہ۔

تاجور سامری بھی ان کے ساتھ وہاں پہنچا۔ دیوان جی ایک سن رسیدہ آدمی تھے گلابی رنگ کی پگڑی اور گرم چغہ پرانی وضع کا۔ چوڑی دار پاجامہ سفید ڈاڑھی لٹکی ہوئی۔ لیکن چہرے سے رئیسانہ غرور اور سخت گرانہ طبیعت کے اثرات عیاں تھے۔ لڑکوں نے ان کی جے بلائی وہ تمکنت سے گویا ہوئے۔ کیسے ہو لڑکو!

"آپ کی دیا ہی" سب بولے۔

اچانک دیوان جی چونکے! ارے یہ تم فضول خرچی ابھی تک جاری رکھے ہوئے ہو تم سے کہا تھا کڑوے تیل کو زیادہ استعمال نہ کیا کرو مہنگی چیز ہے۔ وقت بے وقت کام آنے کی چیز ہے۔ اور تم نے سر پر پوت رکھا ہی۔ جیسے باوا کا مال ہی۔

لڑکے لاجواب ہو کر ایک دوسرے کو چرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔

بدھی چندر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ دیوان جی ہماری حفاظت کا کوئی انتظام کر دیجئے رات کو حملے کا سخت خطرہ لگا رہتا ہی۔

دیوان جی نے ترش رُو ہو کر کہا، میری بات کا خوب جواب دیا۔ واہ رے چالاک لڑکو۔ میں تمہاری حفاظت کیونکر کر سکتا ہوں۔ تم خود جوان ہو! اور پھر بھگوان کی شرن میں پڑے ہو۔ کیا خطرہ ہی تمہیں۔ ہُنہ سودائی کہیں کے۔ دیکھو آگے کے واسطے خیال رکھو کڑوا تیل زیادہ خرچ نہ ہو۔

یہ کہہ کر موٹر کی طرف مڑے۔ اور پھر پلٹ کر کہا۔ اور ہاں آج کل آٹا دال بھی مہنگا ہے

نگر میں بے ضرورت خرچ نہیں ہونا چاہیئے۔ مجھے رپورٹ پہنچی ہے کہ تم نے بیکار مہمان دوست اپنے پاس بٹھا رکھے ہیں۔ یاد رکھو یہاں بیکاروں کے لئے سدابرت نہیں لگا رکھا۔ سر پر آپڑا تو معاف نہیں کرونگا۔ یہ کہہ کر وہ موٹر میں بیٹھ گئے اور ڈرائیور نے موٹر سٹارٹ کر دی۔ پلک جھپکنے میں پھاٹک کے باہر تھی۔

سارے ودیارتھی اداس اور بجھے ہوئے سے اپنے ٹھکانوں کو لوٹے۔ تاجور سامری نے اپنے بھائی (کوی پرکاش) سے کہا۔ بھئی میں چلتا ہوں ناتھ جی کے ہاں۔ یہاں تو سارا گڑ گوبر ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں میرا تمہارے پاس رہنا دیوان جی کو معلوم ہو جائے اور اس کی سزا سب کو بھگتنی پڑے۔

بدھی چندر دھیرے سے کہنے لگا۔ آپ ان کو بکنے دیجئے۔ یہاں سب کچھ ہمارا چاہا ہوتا ہے ایسی خالی خولی دھمکیاں تو ہم دو سال سے سُن رہے ہیں۔

تاجور سامری۔ مگر ہیں وہ واقعی دان ویر کرن۔

اس پر ایک قہقہہ لگا۔ اور کوی پرکاش لنگر میں کھانے کا انتظام کرنے چل دیا۔

اچانک شاہ عالمی چوک کی طرف ایک شور سنائی دیا۔ سارے ودیارتھی گھبرا کر باہر سمادھوں کے پچھواڑے کی طرف بھاگے اور سڑک سے ادھر کھڑے ہو گئے، سامنے امرت سری ہوٹل اسی طرح بند پڑا تھا۔ لیکن اس کے سامنے ایک مسلمان خون میں لت پت پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہوا تھا ——— سامنے ہی چوک میں پولیس کے دو سکھ جوان اس نظارے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اور لاش کے گرد چند لوگ کھڑے اس کے دم توڑنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک وہ سب مندر کے ادھر کو بھاگے۔ تاجور سامری نے بڑھ کر میو ہسپتال جانے والے راستے پر نظر دوڑائی اُسے پولیس کی پوری گارد تیزی سے ادھر

آتی دکھائی دی۔ یہ سب مسلمان سپاہی تھے اور سب انسپکٹر بھی مسلمان۔ چوک والے سپاہی ایک طرف کو کھسک گئے۔ ودیا رتھی اور ان تماشائیوں کا ہجوم ابھی وہیں ڈٹا ہوا تھا کہ گارد نزدیک آگئی اور اس مقتول کو جو اب ختم ہو چکا تھا دیکھ کر سب کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ سب انسپکٹر نے اشارہ کیا اور سپاہیوں نے پھرتی سے رائفلوں کا رُخ اُدھر کر دیا جہاں تاجور سامری کھڑا تھا۔ سب اس ناگہانی آفت کو سر پر دیکھ کر بھاگے۔ تاجور سامری نے پلٹ کر دیکھا تو سپاہی گولی چلا کر جا چکے تھے اور دو ہندو زخمی پڑے تڑپ رہے تھے۔ ایک دودھ والے کا گھٹنا ٹوٹ چکا تھا۔ زمین کا وہ حصہ بھی سُرخ ہو گیا جہاں وہ زخمی لوٹ رہے تھے۔

کوی پرکاش بھاگتا ہوا آیا۔ وہ گھبرا رہا تھا لیکن اچانک تاجور سامری کو دیوار کے پاس کھڑا دیکھ کر سنبھل گیا۔ اور مسکرا کر بولا "میری تو جان ہی جیسے سن سے نکل گئی تھی۔ جب بدھی چند نے آکر کہا۔ گولی چل گئی اور آپ بھی وہیں ہیں۔" یہ کہ وہ اسے ساتھ لے کر لنگر خانے میں جلدی سے گھس گیا۔

کھانا کھا کر تاجور سامری نسبت روڈ اور گوال منڈی میں گھومتا رہا۔ لوگ سہمے ہوئے سے گھروں میں بیٹھے تھے۔ بعض کوٹھوں پر چڑھے لاہور کی وسیع آبادی پر نظریں دوڑاتے دکھائی دیتے تھے۔ یہ لوگ آگ لگنے کی افواہیں سن کر معلوم کر رہے تھے کہ کہاں آگ لگی ہے! نسبت روڈ پر گلیوں کوچوں کی نکڑوں پر آدمی جمع تھے۔ اور ڈیوڑھیوں میں عورتیں۔ سڑک سنسان کبھی کبھی کوئی فوجی موٹر جیپ تیزی سے نکل جاتی۔ جس پر سپیشل پولیس کے جوان رائفل تھامے نظر آتے۔

اچانک کسی نے تاجور سامری کو بلایا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو ڈاکٹر صوفی کو اپنی گلی کی

نکڑ پر کھڑے پایا۔ ان کے پاس میوزک کے مشہور ماہر پروفیسر بی۔ ابن دتّا بھی کھڑے تھے، اب اسے لوٹنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ چنانچہ جب وہاں پہنچا تو سب خندہ پیشانی سے اس سے ملے۔ ڈاکٹر صوفی نے پوچھا۔ کب سے ہیں آپ یہاں؟

یوں تو رات ہی سے لاہور میں ہوں۔ لیکن.....

دتّا جی نے شرارت بھری مسکراہٹ سے کہا۔ لیکن کیا تو گویا ساری رات کہیں کہیں وہاں ——— تو نہیں بتائی؟

ڈاکٹر صوفی بھی مسکرا دیئے اور بولے۔ اجی کہاں! دتّا جی آپ بھی تو غضب کرتے ہیں۔ ان بچاروں میں اتنی ہمت کہاں! پوری بات تو سنئے۔ کہتے کیا ہیں یہ؟

دتا جی اسی انداز سے بولے۔ ہاں کہیئے کہیئے۔ آخر آپ کہاں رہے۔ لاہور میں رات بتانے کا اور تو کوئی ٹھکانہ نہیں۔

تاجور سامری نے قدرے جھینپ کر کہا۔ رات میں اسٹیشن پر ہی رہا۔ کرفیو کی پابندی تھی۔ کیوں کر آتا۔ دن نکلا تو آ گیا۔

دتّا جی نے مسکرا کر کہا۔ اب چاہے کچھ کہیئے۔ بہرحال یہ ایک بہانہ ہی سمجھا جائیگا

ڈاکٹر صوفی! "خیر۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو یہاں کے متعلق کچھ بھی علم نہیں ہم سمجھتے تھے شاید آپ کو ہم سے زیادہ کچھ معلوم ہوگا۔"

تاجور سامری نے کہا۔ جی نہیں آپ کو یہ خوش فہمی تھی۔ ہاں آپ سے یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ فساد کیونکر ہوا ہے۔ کس نے پہل کی؟ کس کو نقصان زیادہ پہنچا؟

ڈاکٹر صاحب نے اپنی نظریں زمین پر گاڑ کر کہا۔ "سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے جلوس پر پہلے ڈی۔ اے۔ وی کالج کے لڑکوں ہی نے پتھراؤ کیا تھا۔ اس کے بعد دوسرے فریق کا

بھڑک جانا یقینی تھا چنانچہ حالات خراب ہوگئے اندر شاید فساد نہیں خطرناک صورت اختیار کرجاتا کہ پنڈت جنک راج سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک گارد کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے پہلے تو صرف تنبیہہ سے کام نکالنا چاہا۔ لیکن۔ وہ کالج کے لڑکے نہ مانے اور پولیس مُردہ باد کے نعرے لگاتے رہے۔ جلوس اور پولیس پر پتھراؤ کرتے رہے۔ اس پر پنڈت جنک راج نے گولی چلانے کا حکم دیا اور اس سے چند نوجوان زخمی بھی ہوگئے۔

اس سے تو پہل ہندوؤں ہی کی طرف سے جان پڑتی ہی! اچھا وزارت کے متعلق کوئی خبر؟

وزارت عملی طور سے ختم ہوچکی کبھی کی! لیکن ابھی چند دنوں کے لئے عارضی طور پر سب وزیر کام کر رہے ہیں ——— میرا خیال ہی اب وزارت کوئی بنا نہیں سکے گا۔ گورنری راج ہی ملے گا۔ ——— آپ کا کیا خیال ہی دتّا جی؟

دتّا جی نے اب ذرا سنجیدگی سے کام لیتے ہوئے کہا یقیناً گورنری راج۔ اس کے سوا اور کوئی حل ہی نہیں۔ فساد کے مسئلے کا۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ میو ہسپتال کی طرف سے ایک ہجوم، گھبراہٹ اور پریشانی کے جوش میں بھاگتا چلا آرہا تھا۔ کوئی ٹھوکر کھا کر گر رہا تھا۔ کسی کی پگڑی اُتر اس کے لئے وبال بن گئی تھی۔ کسی کی دھوتی کی لانگ نے الجھ کر اسے چلنے سے عاری کر دیا تھا۔ ایک شور سے ساری نسبت روڈ گونج اٹھی۔ گلی کوچوں کی نکڑوں پر کھڑے لوگ اپنے اپنے مکانوں میں گھس گئے۔ اور بہت سے گھروں میں بیٹھے۔ کوٹھوں اور بازار کی طرف کھلنے والے بالاخانوں کی چھتوں پر آکر باہر جھانکنے لگے۔ تاجور سامری بھی دتّا جی کے ساتھ ان کے سکول کے بالاخانے پر آکر اس بھگدڑ کو دیکھنے لگا۔ لوگ ابھی تک ہراساں اور بے حال

بھاگے جا رہے تھے۔ اچانک پولیس کی گاڑیں لاریوں نے لاکر اس موقع پر کھڑی کر دیں۔ اور پبلسٹی کی لاری بھی آکر کھڑی ہو گئی۔ اچانک پبلسٹی لاری کا لاؤڈ اسپیکر پورے زور سے پکارا۔ ارے بھاگو مت۔ کچھ نہیں ہوا۔ ٹھیر جاؤ۔ کوئی ڈر کی بات نہیں۔ سنو سنو۔ ایک کام کی بات سنو۔ لوگ یہ سنکر جہاں تھے وہیں رک گئے۔ لاری کے لاؤڈ اسپیکر نے کہنا شروع کیا۔ یہ لوگ بے وجہ ڈر کر بھاگ رہے تھے۔ بات دراصل اتنی تھی کہ سبزی منڈی سے دو سانڈ لڑ کر بھاگ نکلے اس سے چند آدمی بھی ڈر کر بھاگے۔ ان کو بھاگتا دیکھ کر دوسرے لوگوں نے بھی بے سمجھے سوچے بھاگنا شروع کیا ——— معزز شہریو! یہ غلط طریقہ ہے! اس طرح بے تحاشہ اور بے سمجھے سوچے بھاگ نکلنا گنڈوں اور فسادیوں کو موقع مہیا کرنا ہے۔ لاری یہ کہہ کر چلدی لوگ بے خوف ہو کر ہنستے قہقہے لگاتے اپنے اپنے مکانوں کو جانے لگے۔ کوٹھوں والے نیچے اتر کر پھر گلی کوچوں کی نکڑوں پر جمع ہو گئے۔ تاجور سامری بھی میوزک سکول کے بالاخانے سے اترا اور رتن چند ٹینک کو چل پڑا کیونکہ اُسے ڈر تھا کہیں کوئی پرکاش اس بھگدڑ اور غلط افواہ کی بنا پر اُسے ڈھونڈنے کہیں دُور نہ نکل جائے جب وہ چلتا ہوا میو ہسپتال کے پاس پہنچا تو اچانک ایک شخص نے اسکے کندھے پر پیچھے سے ہاتھ رکھا۔ تاجور سامری نے گھبرا کر پلٹ کر دیکھا تو وہ کھل گیا کیونکہ وہ شخص اس کا ایک پرانا دوست ملک آصف علی تھا نہایت ہنس مکھ آزاد خیال اور متحمل مزاج انسان، وہ چھوٹتے ہی بولا۔ کیوں صاحب سیریں ہو رہی ہیں ——— تاجور سامری نے کہا، جی ہاں۔ سیریں یونہی تو ہوتی ہیں؟ جان کے لالے پڑ رہے ہیں۔ ملک صاحب!

آصف علی مسکرا کر کہنے لگا۔ کیا کہنے! کوئی خوف ہوتا تو یوں پھرتے آپ! آیئے دکانپر چلکر باتیں کریں گے۔ یہاں کوئی مسلمان چھرا بھونک دے گا۔

تعارف

گذشتہ چند سالوں میں جہاں اُردو شعر و ادب میں نئی ہیئتوں اور نئے اسلوبوں کے تجربہ ہوئے ہیں بعض ادیبوں نے رپورتاژ بھی لکھے۔ رپورتاژ کو مختصراً ہم واقعات کی ادبی اور محاکاتی رپورٹ کہہ سکتے ہیں۔ ادب کی یہ شکل نہ تو بہت واضح ہے اور نہ اتنی پرانی کہ اس کے حدود معین کئے جائیں۔ مشرقی ادب میں اس سے ملتی جلتی ایک صنفِ ادب وقایع نویسی موجود ہے۔ جس کو مغربی ادب کی "ڈائری" کا ہم پلّہ ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ لیکن ان چیزوں میں تھوڑا تھوڑا سا فرق ہے۔ قدیم وقائع نویسوں کے یہاں تاریخ کا ایک سطحی تصور تھا اور واقعات کی خارجیت اُسے ادبی شکل دیتے ہوئے بھی محض اظہار واقعہ کی حدوں میں رکھتی تھی۔ رپورتاژ بھی حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اور وقائع نویسی سے کسی حد تک مماثل لیکن اس میں وقت کا تسلسل ہر روز ٹوٹنے کے بجائے واقعات کو اپنے لپیٹ میں لیکر اور نمایاں ہو جاتا ہے اور دن رات چوبیس گھنٹوں میں بٹے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے بیانِ واقعہ میں پھیلتے اور سمٹتے ہیں۔

خاصے رہے! تاجور سامری بولا۔ تو آپ گویا مسلمان نہیں۔

کم از کم ان معنوں میں تو نہیں۔ جن معنوں میں آجکل مسلم لیگ والے مسلمانی کی تعریف کر رہے ہیں۔ مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ یہ لوگ جو انسانیت کا اتنا دعویٰ تو کرتے ہیں۔ اصل میں انسان ہیں بھی کہ نہیں! میرا تو لاہور میں دم گھٹنے لگ گیا ہے۔ سوچ رہا ہوں وہ بُرے دن دیکھنے سے پہلے ہی کہیں بمبئی یا کلکتے میں جا ڈیرا لگاؤں۔

تاجور سامری نے کہا۔ یہ تو اچھی بات نہ ہوئی۔ آپ جیسے لوگوں کو اس ماحول کو درست کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور آپ سرے سے یہاں رہنا ہی نہیں چاہتے۔ یہ فرار ہے زندگی سے ملک صاحب!

ملک آصف علی نے کہا۔ دوکان پر چلو یہاں پر بحث کرنا اچھا نہیں۔ تمہارے آنے سے تھوڑی دیر پہلے یہاں چھُرے بازی کی ایک واردات ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ چلو اب باتیں نہ بناؤ زیادہ ——— یہ کہہ کر وہ اسے بے تکلفی سے ساتھ لیکر چل پڑا۔ ہسپتال روڈ پر اسکی دوکان تھی۔ پرانی کتابوں کی۔ اور یہ برسوں سے جگہ مستقل اڈا بن گئی تھی ادیبوں اور شاعروں کا، تاجور سامری جب پچھلے سال یہاں تھا تو دن کا زیادہ حصہ ملک آصف علی کی دکان پر ادبی مباحثوں اور سیاسی گفتگو میں بتاتا تھا۔

رتن چند کی سرائے کی دکانوں میں ملک آصف علی کی دکان ہی اُس وقت کھلی تھی باقی سب بند تھیں سڑک البتہ آباد تھی لوگ آجا رہے تھے۔ لیکن یہ آمد و رفت نہایت بے خلوص اور اُکھڑی سی تھی۔

تاجور سامری نے کہا۔ آپ کی جسارت کی داد دینی پڑتی ہے۔ ملک صاحب! اس زمانے میں بھی آپ دکان کھولتے ہیں۔

ملک صاحب نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔ باقاعدہ! صبح نو بجے سے رات کو نو بجے تک۔ صرف کل سے سر شام ہی بند کرنی پڑ رہی ہے۔ وہ بھی مجبوراً میرا تو اس جگہ کے سوا دل ہی نہیں لگتا۔ اور کہیں۔

اچھا ملک صاحب آپ کو کچھ اس گڑبڑ کی شروعات کا بھی علم ہے! کہ بس دکان پر ارسطو اور افلاطون ہی سے صحبت رہتی ہے۔

ارسطو اور افلاطون سے صحبت تو مرتے دم تک رہیگی۔ البتہ فساد کے بارے میں کچھ ضرور جانتا ہوں۔ ——— پرسوں اسمبلی ہال۔ کے باہر میں بھی تماشائی کی حیثیت سے موجود تھا میرے دیکھتے ہی دیکھتے۔ ہال کے پرے مسلمانوں کا ایک ہجوم ہو گیا۔ لوگ پاکستان زندہ باد مسلم لیگ زندہ باد اور قائداعظم زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے کہ اچانک چیمبر سے ماسٹر تارا سنگھ۔ سردار سورن سنگھ، بہت سے سکھ اور ہندو پاکستان مردہ باد کے نعرے لگاتے باہر آئے۔ اس سے ہجوم میں اشتعال پیدا ہونا لازمی تھا۔ لیکن میاں افتخار الدین نے موقع کی نزاکت بھانپ کر اس ہجوم کو سمجھا بجھا کر منتشر کر دیا۔

اور جو مسلم لیگ کے جھنڈے پھاڑنے کا الزام ہے ماسٹر تارا سنگھ پر؟ تاجور سامری نے پوچھا۔ وہ محض الزام ہی ہے۔ یار لوگوں کو بے پر کی اڑانے سے کون روک سکتا ہے۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ انہوں نے صرف مخالفانہ نعرے لگائے۔ آصف علی یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ تاجور سامری نے کہا اب مجھے اجازت دیجیے۔ چھوٹا بھائی پریشان ہو رہا ہو گا۔ پھر ملونگا۔

ضرور جائیے۔ لیکن بازار میں اس طرح منہ اٹھا کے گھومنے سے خدا کے لئے باز آئیے۔

تاجور سامری نے اٹھتے ہوئے کہا۔ نہیں اب نہیں پھرونگا۔ جی اوبا تو یہیں آونگا یہ کہہ کر وہ دکان سے باہر آیا اور سرائے کے بیچ سے ہوتا ہوا اپنے بھائی کے پاس پہنچا وہاں

سب اسی کی باتیں کر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر سب خوش ہو گئے۔ کوی پرکاش بولا "میں تو جانے کو تھا ناتھ جی کے ہاں۔ اچھا ہوا آپ آ گئے۔ ورنہ آپ کو وہاں نہ پا کر بڑی کوفت اور پریشانی ہوتی۔

ملے ناتھ جی!" تاجور سامری نے سر ہلا کر ہاں میں جواب دیا ——— اچانک سب کی نظریں حیرانی سے سمادھوں کے پچھواڑے کو جانیوالے کنارے کی طرف اٹھیں، ارے یہ کیا، سب پکار اٹھے کوی پرکاش نے پوچھا۔ یہ تھان کہاں سے مار لائے گوپی۔"

گوپی کے چہرے پر خوف اور فتح کے ملے جلے آثار چھا رہے تھے۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ایک تھان کیا۔ پرس رام کے پاس چپلوں کا وہ بنڈل بھی ہے۔

"پرس رام"۔ بدھی چندر حیرت سے بولا۔ "وہ کہاں ہے! تمہارے ساتھ گیا تھا؟"

گوپی "ہاں پیچھے رہ گیا ہے۔ پیشاب کرنے کے لئے"۔ اسی وقت پرس رام بھی آ پہنچا اس کے پاس چپل کا ایک بڑا سا بنڈل تھا۔

گوپی نے کہا۔ لو سب عیش کرو ہمارے مال پر۔

کوی پرکاش نے شرارت سے کہا۔ کیا خوب۔ جیسے باوا کا مال ہے۔ ڈاکو کہیں کے؟

پرس رام "چلئے جی ڈاکو ہی سہی۔ تمہاری طرح بزدل تو نہیں"۔

تاجور سامری نے کہا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ مجھے بھی تو پتا چلے۔

گوپی نے فاتحانہ انداز سے کہنا شروع کیا۔ آج کی آرتی کے لئے حاضری لگوا کر میں رنگ محل میں گیا تھا۔ ویدکالی چرن کے پاس ابھی وہاں بیٹھے مجھے پندرہ منٹ ہی بیتے تھے کہ ایک شخص نے گھبرائے سے انداز میں آ کر خبر دی کہ آج مسلمانوں میں خوب تیاریاں ہو رہی ہیں۔ لوگ پاس کی مسجد میں جمع ہو رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہاں کچھ شرارت ہو جائے۔

ویدجی نے گھبرا کر کہا۔ کہ آج تم جاؤ۔ تمہارا کام کل ہو گا۔ میں نے کہا آپ تو افواہوں

ہی سے ڈر گئے۔ میرے ہوتے آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ وہ بولے ایسے ہی تو بہادر ہو تم۔ میں نے کہا ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ اچانک ویدجی چونک اٹھے ان کی نظر گلی کے نکڑ والے کھمبے پر گڑی تھی میں نے بھی ادھر دیکھا تو ایک مسلمان کو اپنی طرف پیٹھ کئے کھڑا دیکھا وہ اس طرح کھڑا تھا جیسے کوئی شرارت کیا چاہتا ہو۔ میں نے کہا آپ چپکے بیٹھئے۔ وہ بولے تم کیا کروگے؟ میں نے کہا دیکھئے تو آپ، یہ کہہ کر میں نے اپنا کمانی والا چاقو نکال چپکے سے اس کے پیچھے سے جاکر اسکی پیٹھ میں پوری طاقت سے گھونپ دیا۔ ایک خوفناک چیخ کے ساتھ وہ گر پڑا اور خون کا فوارہ چھوٹنے لگا۔ اب ویدجی نے بھی ہمت کی اور ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس کا سر کچل دیا۔ سارے بازار میں اس واقعہ سے ہل چل مچ گئی۔ لوگ ڈرنے لگے۔ کہ اب ضرور کوئی گل کھلے گا۔ اچانک فضا میں اللہ اکبر کے نعرے گونجنے لگے..... اس بازار کے مسلمان دکاندار جلدی سے دکانیں بند کر کے بھاگ گئے تھے۔ اس ہجوم کے ساتھ برچھے لئے آپہنچے۔ سارے بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔ ہو سکتا ہے کہ مسلمان پالا مار لیتے لیکن ایشور نے بروقت مدد کی اور ہمارے اپنے وزیر صاحب کی کار وہاں آکر رکی اور آکر انہوں نے اپنے ساتھ کے سپاہیوں کو گولی چلانے کا حکم دیا۔ سپاہی ہندو تھے۔ خوب بارش کی گولیوں کی، ہمارے حوصلہ بڑھ گئے۔ اور مسلمان سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے۔ لالہ جی نے کہا کہ کرلو لڑکو من مانی۔ بس پھر کیا تھا میں نے تو فوراً ایک کپڑے کی دکان کا تالا اس پتھر سے توڑ دیا۔ جس سے ویدجی نے اس مسلمان کا سر کچلا تھا۔ دوسرے لوگوں نے بھی ہمت کی اور مسلمانوں کی دکانوں کو لوٹنا شروع کیا۔ آج تو پرسرام نے بھی بزدلی چھوڑ دی ہے۔ دیکھ لو۔ برابر ہاتھ مارا ہے ظالم نے۔

یہ سن کر سب خوش ہو گئے۔ لیکن تاجور سامری اور کوی پرکاش اچانک خاموش ہو گئے بدھی چندر۔ ان دونوں کی اس سنجیدگی کو ٹھٹھوں میں اڑاتے ہوئے کہنے لگا۔ معلوم

ہوتا ہے آپ دونوں کو گوپی ناتھ اور پرسرام کے اس کارنامے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی؟ تاجور سامری منہ کھولنے ہی کو تھا کہ گوری پرکاش نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔ چنانچہ وہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے بھائی کی کوٹھڑی میں جا کر لیٹ گیا۔ اور اس بڑھتی ہوئی درندگی کے متعلق سوچنے لگا۔ اُس کا خیال اُس عہد کی طرف جانے لگا۔ جب لوگ صرف پُرامن شہری یا محبتی اور روادار پڑوسی تھے۔ ہندوؤں کی بیٹی کو مسلمان اپنی بیٹی اور مسلمان کی عزت کو ہندو اپنی عزت سمجھتا تھا۔ آپس میں دوستی اور ساجھی پن کا چرچا تھا۔ اب وہ اس زمانے میں گھوم پھر رہا تھا جب لوگ گاندھی اور جناح۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے ناموں اور ہندو اور مسلم کی اس وحشیانہ درندگی سے ناآشنا تھے اُسے یاد آیا کہ اس کے نانا اپنے اُس گانوں میں ایک بزرگ حاکم کی حیثیت رکھتے تھے جس کی آبادی ساری کی ساری مسلمان تھی۔ لیکن لوگ اس بوڑھے برہمن کی عزت کرتے تھے اسکی دانائی اور انسانیت سے محبت کرتے تھے —— اس کے ہر فیصلے کو مانتے تھے۔ وہ زمانہ جب ہندو عید اور محرم کے تہوار مسلمانوں کے ساتھ ملکر مناتے تھے، اور دیوالی، بسنت اور بیساکھی ہندو سے ملکر مناتے —— تاجور سامری کو وہ دن بھی یاد آگیا جب اس کا بخار نہیں جاتا تھا تو اسکی نانی اُسے مسجد کے امام صاحب کے پاس لے گئی اور امام صاحب نے بڑے پیار اور محبت سے اس پر ایسا دم کیا کہ بخار ہمیشہ کے لئے جاتا رہا۔

وہ دن —— اور آج —— یہ دن! ہندو اور مسلمان نام ہے۔ آگ اور پانی کا کتے اور بلی کا، یہ نہیں کہا جا سکتا یہاں میں کتا کون ہے اور بلی کون۔ لیکن یہ ضرور ایک حقیقت ہے کہ دونوں فرقے آج کم از کم انسان تو نہیں رہے۔ ہندو مسلمان ہوں تو ہوں۔ اس نقطہ سے اچانک اس کے ذہن میں خاں صاحب اور شیخ جی کی محبت اور خلوص بھری شفقتیں سامنے آگئیں۔ وہ ایک لمحے کو اُن سچائی اور امن کے پتلوں کے ساتھ خیالی طور پر باتیں کرتا رہا

اور پھر سردار جی کا وہ بھولا بھالا، مگر ہنس مکھ چہرہ سامنے آگیا ——— اچانک اس رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لئے مولوی صاحب کی مکروہ اور فریبی صورت سامنے آگئی۔ لائل پور کے ایک مندر کے بد معاش مہنت کی مکار آنکھیں اس کی روح میں گڑنے لگیں ——— ان خیالی صورتوں سے تاجور سامری بھنّا اُٹھا۔ جھلا کر اٹھ بیٹھا اور ہمایوں کا تازہ پرچہ اپنے بیگ سے نکالکر پڑھنے لگا۔ یہ پرچہ اُسے لاہور کو روانہ ہونیوالے دن کی صبح کو ملا تھا۔ جسے یہ وقت گذاری کے لئے اپنے ساتھ لیتا آیا تھا ——— ورق الٹے جا رہے تھے لیکن طبیعت نہیں جمتی تھی وہ پرچہ ایک طرف رکھ کر پھر لیٹ گیا اور اسی اوھیڑ بن میں اس کی آنکھ لگ گئی۔

نہ جانے وہ کتنی دیر سویا رہا کہ اچانک کسی نے اس کا بازو پکڑ کر ہلا دیا۔

وہ ایک مہیب خواب دیکھ رہا تھا۔ اس مداخلت سے وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کوی پرکاش نے اطلاع دی۔ عبدالمتین عارف آئے ہیں۔

تاجور سامری نے ہوش سنبھالتے ہوئے کہا کہاں ہیں وہ لے آنا تھا ان کو یہیں! عارف نے کوٹھری کے چھوٹے سے دروازے میں جھککر داخل ہو کر کہا۔ آداب عرض ہے۔ یہ رہا خادم یہ کہہ کر وہ خاموش مسکراہٹ بنکر رہ گیا۔ تاجور سامری نے اُٹھ کر خلوص اور محبت سے اپنے پاس بٹھایا۔ عارف سے اسکی یہ دوسری ملاقات تھی۔ پہلے وہ اُسے ادب لطیف کے دفتر میں ملا تھا۔ اسکی عمر بیس اور پچیس کے درمیان ہوگی۔ لیکن چہرے پر کی سادگی اور خلوص سے وہ ایک کمسن لڑکا نظر آتا تھا۔ بات بات پر مسکرا پڑتا اور پھر دیر تک مسکراہٹ کے انداز میں رہتا۔ ایسی خوبیاں تھیں، تاجور سامری نے اُسی دن سے عارف کو اپنا دوست سمجھ لیا۔

اس ملاقات اور آج کے ملنے میں پورا ایک سال کا فاصلہ تھا۔ لیکن عارف کا خلوص سادگی اور دائمی مسکراہٹ آج بھی وہی تھی۔ بلکہ آج وہ اسے اپنے زیادہ قریب محسوس

ہو رہا تھا۔ آخر اس نے مہرِ خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا: "آپ کو میرا آنا کیوں کر معلوم ہوا؟

عارف نے حیرت آمیز مسکراہٹ سے کہا، بھول گئے آپ ہی نے تو مجھے آج کے دن یہاں ملنے کو لکھا تھا! آپ نے کاغذ دینے میں جو ایثار دکھایا ہے مجھے اس کی امید نہ تھی کہ آپ مجھے ممنونیت کا موقع دیں گے۔

تاجور سامری نے کہا، آپ کا یہ خیال عام ہندو ڈنر تو عائد ہو سکتا ہے۔ لیکن میں تو فنکار پہلے ہوں۔

عارف نے بات کو یہیں روکتے ہوئے کہا۔ معاف کیجئے۔ میرا یہ مقصد نہیں۔ اچھا چھوڑیئے اس موضوع کو کہیئے اب یہاں رہئے گا یا رہنے کا ارادہ کر کے آئے ہیں۔

تاجور سامری نے اداس لہجے میں کہا۔ میں اس درندہ آبادی میں کس طرح رہ سکتا ہوں؟ لائلپور میں اس سے کہیں زیادہ حالات اچھے ہیں۔ میں نے تو فیصلہ کیا ہے اب کبھی لاہور کا رُخ نہیں کرونگا۔ ملعنت شرارتوں کی نگری ہے۔ سراسر۔

عارف اس دوران میں مسکرا رہا تھا۔ جب وہ اپنی بات ختم کر چکا تو دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔ دوست! آپ کی یہ مایوسی ہے تو بجا لیکن اس کا علاج فرار ہرگز نہیں۔ آپ خود مجھ سے پہلی ملاقات میں کہہ چکے ہیں کہ مصیبت سے مقابلہ نہ کرنا فرار ہے۔ اور فرار کا نتیجہ اندھیارے کے سوا اور کچھ نہیں۔ آپ کو اگر لاہور کے اس پہلو سے دُکھ پہنچا ہے تو اس کے خلاف جدوجہد کیجئے۔ اور اپنے کو اس جدوجہد میں اکیلا نہ سمجھئے۔ مجھ جیسے بیشمار آپ کے ساتھ ہونگے۔

وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ باہر کچھ شور سنائی دیا۔ عارف نے گھبرا کر کہا، اچھا دوست مجھے اب اجازت دو۔ پھر ملونگا۔ شہر کی حالت ہر روز بگڑتی چلی جا رہی ہے۔ مجھے ظفر صاحب سے تمہارا پتا چلا۔ اس لئے سوچا چلو کاغذ کے کوٹے کا شکریہ ہی ادا کر آؤں۔

تاجور سامری نے کہا۔ ابھی آئے اور ابھی چلے ——— کیا مذاق ہے!

عارف نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ یہ مذاق نہ جانے کب تک چلے۔ اچھا اجازت ہے۔

تاجور سامری نے اس کو رخصت کر کے پھر کوٹھری کی پناہ لے لی۔ اور لیٹا کہ کوی پرکاش اندر داخل ہوا۔ اور گھبرائے سے انداز میں کہا گئے عارف

تاجور سامری نے کہا۔ ہاں گئے۔ لیکن باہر شور کیا تھا؟

کوی پرکاش بولا "گوپی اینڈ پارٹی اس بات پر پیچ و تاب کھا رہی ہے کہ عارف یہاں کیوں آیا۔ چوکیدار بھی ان کی حمایت کر رہا تھا۔ سب کہہ رہے تھے ہم اُس ملیچھ کو یہاں سے زندہ نہیں جانے دیں گے! بدھی چندر، پرسرام اور میں اسکی مخالفت کر رہے تھے۔ اور وہ سب شور مچا رہے تھے کہ نہیں ہم اس مسلمان کو اسکے مسلمان ہونیکی سزا دیں گے۔ سب کو اپنی شیخیوں میں مست دیکھکر بدھی چندر نے مجھے اشارہ کیا کہ جا کر عارف کو وہاں سے چپکے سے بھگا دوں۔ سو اچھا ہی ہوا کہ وہ چلے گئے۔ وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ وہ لوگ وہاں آگئے۔ گوپی نے پوچھا وہ مسلمان کہاں ہے؟ تاجور سامری نے بات بناتے ہوئے کہا "وہ مجھے ملنے کو یہاں غلطی سے آگیا تھا میں نے کہا کہ بھئی اب تم چلے ہی جاؤ تو اچھا ہے۔ اس بہانے میں میری تیری دوستی کیسی۔ یہ سنکر وہ ناراض ہو کر چلدیا۔"

گوپی خوش ہو گیا "ناراض ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ رُک جاتا نہ دم بھر کو کہ بچہ جی کو پہنچا دیتا سیدھا جنت کو ———"

اور ادھر بدھی چندر، پرسرام۔ اور کوی پرکاش۔ تاجور سامری کی اس ایکٹنگ پر جی ہی جی میں خوش ہو رہے تھے۔

سکھ چوکیدار کہنے لگا۔ میں نے تو پہلے کہا تھا گوپی ناتھ! کہ پنڈت جی ایسے مُورکھ

ہیں ـــــ یہ تو کوی پرکاش ہی مسلمانوں کو اچھا سمجھتے ہیں۔ جیل پہنچ جاتا تو میری کرپان کے جوہر دیکھتے آپ سب!

تاجور سامری نے بناوٹی سنجیدگی سے کہا، سردار صاحب بھلا میں ایسا سوچ بھی کیوں کر سکتا ہوں! بھلا مسلمان اور دوست یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔

دھم بادشاہ نے فرمایا ہے کہ مسلمان اگر تیل میں بازو ڈبو کے اور پھر وہ بازو تولوں کی بوری میں گھسائے اور جتنے تل اس پر لگیں۔ اگر اتنی قسمیں بھی کھائے تو مسلمان پر یقین نہ کرو۔

یہ سنکر تاجور سامری کی بنیاد کی سنجیدگی کا ملمع اترنے لگا۔ اس کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا لیکن بدھی چندر نے آنکھ کا کونہ دبا کر اسے ہشیار کر دیا۔ چنانچہ تاجور سامری نے پھر بات کا رُخ بدلا۔ جی مسلمان تو خیر ہمیں کیا دھوکا دینگے ہم بھی تو کچی گولیاں نہیں کھیلے۔ ہماری بھی تو تاریخ بھری پڑی ہے انہی باتوں سے ہم نے تو دشنو اور برہما کی ایک نہیں چلنے دی۔ بھلا یہ مسلمان کیا عیار اور جھوٹے ہونگے ہمارے مقابلے میں۔ ذرا ہو تو لینے دو سامنا! پھر دیکھئے کیا گل کھلتا ہے۔

گوپی ناتھ اور سردار جی اس طنز کو نہ سمجھے اور خوش ہو گئے۔ بدھی۔ کوی پرکاش اور پرسرام تاجور سامری کی اس طنز پر جی ہی جی مزے لے رہے تھے۔

تاجور سامری ان کو اسی حال میں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ اور چوکیدار کی ننھی لڑکی سے کھیلنے لگا۔

ایک بے پناہ شور سے اکیدم تاجور سامری گہری نیند سے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھوں سے کسی خوفناک خواب سے ڈر جانے کے آثار جھلک رہے تھے۔ وہ رات بھلدی ہی کبوتر والے چبوترے پر ایک چھوٹی سی چارپائی ڈال کر

سو گیا تھا۔ کوی پرکاش دوڑ کر اس کے پاس آیا وہ گھبرایا ہوا تھا۔ ہانپتے ہوئے بولا۔ آپ اپنی چارپائی سادھوں کے اندر ڈال لیجئے یہاں شور سے نیند نہیں آئیگی..... وہ کسی ہونیوالے حادثے کے خوف کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا تاجور سامری اب پورے طور پر ہوش میں آچکا تھا کہنے لگا اب اور نہیں سوؤنگا۔ بہت نیند لے چکا۔ اب تمہارے ساتھ پہرہ دونگا۔

"آپ کی مرضی" کہہ کر پرکاش لاٹھی کندھے پر رکھے چلدیا ——— وہ ایک عجیب قسم کا شور۔ لاکھوں گلوں سے نکلتی ہوئی آوازیں۔ موٹی پتلی سپاٹ آوازیں۔ ڈری ہوئی۔ جوشیلی آوازیں۔ معلوم ہوتا تھا گویا صدیوں پرانی خاموش رُوحوں کو بولنے کی طاقت ملگئی ہے۔ اور وہ آج سے ہزاروں سال پہلے کی کوئی زبان بول رہی ہیں ——— تاجور سامری اٹھا اور پورے تالاب کا چکر کاٹ کر دوسرے کنارے پہنچا۔ سارے ودیارتھی۔ اور کچھ دھوبی سروں پر بھاری منڈاسے باندھے ہاتھوں میں برچھے اور لاٹھیاں لئے کھڑے اس شور وغل کے متعلق رائے زنی کر رہے تھے۔ گوپی اسے آتے دیکھ کر بول اٹھا۔ لیجئے۔ آپہنچے۔ تاجور سامری بھی۔ میں نہ کہتا تھا وہ ضرور ہمارے ساتھ پہرا دیں گے۔ مگر کوی جی تو اپنی ہی ہانکتے رہے.....

بدھی چندر نے کہا۔ ان کو آرام کرنے دیا ہوتا، کوی جی؟ کیا کریں گے ہمارے ساتھ جاگ کر۔

تاجور سامری نے کہا۔ ان کی کوئی خطا نہیں میں اپنی مرضی سے آیا ہوں ——— ہاں یہ شور زیادہ ہی ہوتا جا رہا ہے کچھ معلوم کیا کیا بات ہے۔

گوپی نے جواب دیا۔ آج رات ضرور کچھ ہوگا۔ مسلمان آج رنگ محل کے نقصان کا بدلہ ضرور لیں گے۔ اتنے میں سکھ چوکیدار بھی کرپان سے لیس ہو کر آگیا۔ اور ذرا خاص انداز میں کہنے لگا کچھ سُنا! رنگ محل میں آگ لگادی مسلمانوں نے۔ ایک سکھ سپاہی ابھی ابھی مجھے بتا کر گیا ہے۔

رپورتاژ کسی خاص واقعہ سے متعلق ہوتا ہے۔ اور لکھنے والے کے نقطۂ نظر کا ترجمان لیکن ڈائری کی طرح محض ذاتی اور شخصی تاثرات کا مجموعہ بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ مجموعی تاثرات کا اظہار ہوتا ہے۔ کئی حیثیتوں سے رپورتاژ کو ناول یا افسانے کے قریب بھی رکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کے عناصر ترکیبی میں بھی وہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں جو ناول اور افسانے میں ملتی ہیں۔ صرف تخلیقی قوت سے کام لینے اور مقصد کے لئے کردار اور فضا پیدا کرنے کا فرق ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ رپورتاژ کی سرحدیں وقائع نویسی، ڈائری، ناول اور افسانے سے کئی جگہ مل جاتی ہیں اس وقت اس کی حقیقت اور ماہیت کے تعین کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اسے واقعات کا وہ خام مواد کہہ سکتے ہیں جس سے تاریخ، ناول۔ اور افسانے میں زبردست مدد لیجا سکتی ہے۔

اردو میں اب تک صرف چند قابل ذکر رپورتاژ میری نظر سے گذرے ہیں۔ ان میں کرشن چندر کا "تو دے" اور بعض حیثیتوں سے محمود ہاشمی کا "پیر پنجال کے قیدی" اہمیت رکھتے ہیں۔ اور آج تاجور سامری کا لکھا ہوا ایک دلچسپ، اہم اور معلومات افزا رپورتاژ۔ "جب بندھن ٹوٹے" میرے سامنے ہے۔ کئی حیثیتوں سے یہ سب سے زیادہ اہم اور قابل مطالعہ ہے۔ کیونکہ اس میں فرقہ وارانہ فسادات کی آنکھوں دیکھی وہ تصویر پیش کی گئی ہے جس نے ہم میں سے اکثر جذباتی ادیبوں اور شاعروں کو غلط فہمی کی حد تک ہندوستانیوں سے بدظن کر دیا ہے۔ جس دور میں انسانوں کی انسانیت پر شک ہونے لگے۔ اس دور کو خود شک کی نظروں سے دیکھنا چاہیئے۔ کیونکہ انسان کی انسانیت صرف خاص حالات میں مرتی ہے۔ وہ خود غرضی، مایوسی اور گمراہی کا شکار ہو کر ایک دوسرے پر جھپٹتے ہیں اور یہ جذبات جبلّی یا ابدی طور پر ان میں

گوپی اچھل کر بولا تو پھر میں نہ کہتا تھا وہ کمبخت ضرور کوئی شرارت کرینگے۔ اچھا! ہم کون سے موم کے بنے ہیں۔ وہ ہاتھ دکھائینگے کہ مسلمانوں کو چھٹی کا دودھ یاد آجائیگا۔

سردارجی بولے۔ سامنا ہونے پر دیکھنا میری کرپان کیا کرتی ہے۔ پانچ سال فوج میں رہا ہوں بصرے کی لڑائی میں تو میں نے اپنے افسر کو ایک مرتبہ تو حیران کردیا تھا۔ حوالدار ہو جاتا۔ لیکن لڑائی ختم ہو گئی اور مجھے گھر کو لوٹنا پڑا۔

گوپی نے کہا۔ اب کیا بگڑا ہے سردارجی ہم بنائیں گے آپ کو حوالدار کیا اس سے بھی کچھ آگے۔ سردار صاحب کچھ کہنے کو تھے کہ کہیں دور سے ست سری اکال کا نعرہ فضا میں گونجا۔ سردار صاحب جوش میں آگئے اور کرپان نکالکر چاندنی میں چمکانے لگے۔ اور بولے آج تو خالصہ بھی گرجا ہے۔ بس اب مسلمانوں کے بُرے دن آئے سمجھو! ——— اب کرشنا گلی کی طرف سے ہر ہر مہادیو کی پھیلاؤ دار گونج نے ہندو نوجوانوں کی زندگی کا ثبوت دیا۔ اس پر تالاب والوں میں بھی حرکت پیدا ہو گئی نعرہ بجرنگ یہ گوپی کی آواز تھی اور سب بولے، ہر ہر مہادیو ——— جب مہادیو کی صدا ختم ہوئی تو دیکھا کہ سردارجی آنکھیں موندے ست سری اکال کا سُر گنگنا رہے تھے۔

اس پر کوئی پکارا بولے سو نہال ——— اور سب نے جواباً کہا۔ ست سری اکال۔ اب چوکیدار خوش تھا۔ اب فضا میں نعروں کی جنگ ہونے لگی۔ لاہور کے چاروں کونے ہر ہر مہادیو ست سری اکال اور اللہ اکبر کی صداؤں سے آباد تھے انسان اور اسکی انسانیت سو گئی نعرے اور شیطانیت جاگ اٹھی۔ اب یہ شور و غل قیامت کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اچانک ان نعروں کے بیچوں بیچ ایک دھماکے کی سی آواز گونجی۔ سردارجی بولے۔ بم پھٹ گیا ہے کہیں۔ گوپی بولا یہ ہمارے ہی سوئم سیوکوں کا کام معلوم ہوتا ہے۔ بدھی چندر بولا۔ مگر آواز شاہ عالمی کے آس پاس سے آئی معلوم ہوتی ہے۔ نعرے اور شور اب اور بھی تیز اور زور دار ہو گیا۔ تالاب والے اور کرشنا گلی

والے۔ نبست روڈ والے اور شاہ عالمی کے بانکے نعروں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ دور مسلمان محلّوں کی طرف ——— اچانک گولی چلنے لگی۔ سب چونکے۔ سردار جی کہنے لگے۔ پولیس نے گولی چلا دی ضرور کچھ واردات ہوگئی۔ جان پڑتی ہے۔

اب گولی کی آواز نزدیک آنے لگی۔ گوپی نے کہا۔ یہ تو چوک میں چلا رہا ہے گولی۔ کوئی۔ تاجور سامری نے کہا۔ دیکھوں ذرا۔ اور آگے بڑھنے لگا کہ کوئی پرکاش نے فوراً ہاتھ تھام لیا۔ ایک دھوبی جوش میں آکر دوڑ کر دیوار پر چڑھ گیا۔ اچانک ٹھائیں کی آواز آئی اور وہ دھوبی لڑکھڑاتا ہوا زمین پر آرہا! اب کچھ گولیاں تاڑ توڑ تالاب میں پڑیں سارے ودیارتھی مندر کی اوٹ میں ہوگئے۔ لیکن سردار جی ایسے گھبرائے کہ کرپان پھینک بھاگ نکلے۔ گھبراہٹ میں راستہ بھی نہ سوجھا اور تالاب میں گر پڑے۔ اس پر سب بے اختیار ہنس پڑے۔ گوپی نے سب کو ایک سردار کی طرح ڈانٹا اور وقت کی نزاکت کا احساس دلایا۔ اور تالاب میں کود کر گھبرائے ہوئے چوکیدار کو باہر نکال لایا۔ چوکیدار شرم کے مارے بھیگی بلی کی طرح ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ سب ہنسنا چاہتے تھے لیکن وہ وقت کی نبض پہچان کر چپکے رہے۔

چاند پچھم میں جھک گیا تھا اور اب ان نعروں اور چیخوں، اور گولیوں کی ٹھائیں ٹھائیں کو وقت نے خاموش کر دیا تھا۔ فضا کا سکون بحال ہو چکا تھا اور ودیارتھی ——— بیٹھے بیٹھے اونگھ گئے تھے۔ یہ دیکھ کر تاجور سامری پھر اپنی کھاٹ پر آکر لیٹ گیا اور خیالوں کی ادھیڑ بن میں اسکی آنکھ لگ گئی۔

سنکھ کی گونج اور گھڑیالوں کی ڈھنکار سے تاجور سامری جاگا اب اس کی تکان اور بے خوابی دور ہو چکی تھی سارے ودیارتھی نہا دھو کر آرتی کے لئے جا چکے تھے۔ اس نے کھاٹ اٹھائی اور اسی اپنی کوٹھری کے باہر دیوار سے لگا دیا۔ جیسے ہی کمرہ خالی ہوتے ہی کبوتر کے ٹھٹ کے

ٹھٹ اتر آئے وہ اب تک مندر اور دوسری دیواروں پر بیٹھے حیرانی سے اس نئے شخص کو دیکھ رہے تھے۔ جو غیر متوقع طور پر ان کی جگہ پر قابض تھا ——— تاجور سامری دور بیٹھا ان کی محفل میں خیالی طور پر شامل ہو گیا وہ سوچنے لگا ان کبوتروں نے یہ قیامت کی سی رات نہ جانے کس طرح بتائی ہو گی؟ ساری رات تو چوں تک نہیں کی۔ بچاروں نے کہیں دبکے رہے ہوں گے غریب اور پھر یہاں رہتے ہوئے عادی تو ہو گئے ہوں گے۔ اس قسم کے شور وغل کے لیکن آپس میں کتنا میل جول کتنا پیار نظر آتا ہے ان میں۔ یہ فضا کی ابتری اور غذا کی نایابی بھی ان کو الگ الگ نہ کر سکی آدمیوں کی صحبت میں رہ کر بھی آج کے معنوں میں آدمی نہ بن سکے کاش آدمی آدمی نہیں بنا تھا، تو کم از کم کبوتر ہی بن جاتا۔ تاجور سامری یہ سوچتا ہوا خیالوں کے اتھاہ سمندر میں ڈوبنے لگا۔

اور ——— ڈوبتے ڈوبتے آخر باہر کی دنیا سے کٹ کر رہ گیا۔

آگ بھڑک گئی

شاہدرہ کے باہر سے ہو کر لاری جہانگیر بادشاہ کے مقبرے کے قریب ریلوے پھاٹک پر آکر رک گئی۔ لاہور سے آتی ہوئی ایک اور سواریوں سے بھری ہوئی لاری وہاں کھڑی تھی۔ اس کا ڈرائیور شاہدرہ کی طرف سے آنے والی اس لاری کے ڈرائیور سے اونچے گلے سے باتیں کرنے لگا ——— وہ کہہ رہا تھا۔ لاری واپس لے جاؤ۔ لاہور کی حد میں گھسنے کی کوشش نہ کرو ——— شہر میں فساد کی آگ بھڑک اٹھنے کے کارن ۲۴ گھنٹے کا کرفیو لگا دیا گیا ہے۔ دوسرے ڈرائیور نے جواب دیا۔ اب یہ کس طرح ہوگا؟ واپس جانا میرے ہی اختیار میں تو نہیں ساری سواریاں ایسا چاہیں تبھی ہو سکیگا پہلا ڈرائیور بولا۔ احمق ہو۔ سواریاں تمہارے خیال میں موت کے منہ میں جانا زیادہ پسند کرینگی ہیں کم از کم اس خوش فہمی میں نہیں۔

"اچھا کوشش کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ سب سُن رہے ہیں نا اب ہم لاہور نہیں پہنچ سکتے میری رائے میں اب لوٹنے کے سوا کوئی چارا نہیں اس پر لاری میں منمنانے اور سٹپٹانے کی سی آوازیں پیدا ہونے لگیں۔ جنکو ضروری کام سے لاہور پہنچنا تھا وہ ڈرائیور پر سستی اور بہوشی کا الزام دے رہے تھے ——— اور وہ سب کی سنی ان سنی کر کے اس پر زور دے رہا تھا کہ اب ہم لاہور نہیں پہنچ سکتے۔ کم از کم میں اپنی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ تم میں سے جس کو جان عزیز نہ ہو اتر کر چلا جائے۔ وہ راہ رستہ لاہور کا

یہ کہہ کر اس نے راوی کے پل کی طرف جانے والی چمکتی ہوئی سیاہ سڑک کی طرف انگلی اٹھائی یہ سنکر سب سواریاں بجھ کر رہ گئیں۔ اور لوٹنے کی رضامندی ظاہر کر دی۔ ڈرائیور نے خوشی کے مارے فوراً موٹر سٹارٹ کی اچانک ایک شخص کود کر لاری سے باہر آگیا۔ یہ تاجور سامری تھا۔ ایک سردار جی نے کہا۔ بھائی کیوں خطرے میں کودتے ہو، چھوڑ دو دیوانگی، آؤ بیٹھو واپس چلیں۔

تاجور سامری نے جھلا کر جواب دیا "تم سب ڈرپوک ہو۔ تم سب واپس جا سکتے ہو میں ضرور لاہور جاؤنگا ——— مجھے خطرے کی کوئی پروا نہیں۔ میں اپنے ارادے کو نہیں چھوڑ سکتا۔" ساری سواریاں پکار اٹھیں یہ دیوانہ ہے۔ جبھی ہے۔ اسے جانے دو موت کے منہ میں تم لاری چلا دو۔ ڈرائیور ——— اور ڈرائیور نے لاری چلا دی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں اس جگہ پر ویرانگی ناچنے لگی۔ تاجور سامری اکیلا چوراہے پر کھڑا اس لاری کو نفرت سے دوری اور غبار میں گم ہوتے دیکھتا رہا۔ اب بچائی اپنا بھیانک روپ دکھانے لگی تھی۔ اور اس کا جوش اور غصہ سرد پڑنے لگا تھا۔ وہ چمکتی ہوئی سڑک اور خوب صورت ہرا بھرا سبزہ زار اب خوفناک ہوتے جا رہے تھے۔ سامنے جہاں گیر کا مقبرہ اب اُسے ڈراؤنی نظروں سے گھورتا ہوا کوئی گنڈا دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کی خوشنمائی اور رعب اب ایک پُراسرار دہشت میں بدلتے جا رہے تھے۔ اب وہ ایسا محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ کسی فسادی علاقے میں بے آسرا کھڑا ہو۔ اچانک وہ چونکا۔ لاہور کی طرف سے چند مزدور ادھر آ رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بھاری لٹھ اور دوسرے کے پھاوڑا تھا۔ باقی خالی ہاتھ تھے۔ وضع قطع سے مسلمان نظر آتے تھے۔ تاجور سامری کو موت اپنے قریب ناچتی دکھائی دینے لگی۔ یہ ضرور گنڈے ہوں مجھی جیتا نہ چھوڑیں گے۔ اس نے گھبراہٹ میں اپنے لباس اور ہیئت پر ایک تنقیدی نظر ڈالی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس میں ہندوپن کی ظاہراً کوئی بات نظر نہیں آتی۔ اس طرح مطمئن ہو کر وہ لباس

کے سہارے بر بچاؤ کا راستہ نکالنے لگا۔ کہہ دوں گا میں کمالیہ کے سجادہ نشین صاحب کا مرید ہوں پڑھ دوں کا ایک آدھ عربی کی آیت چاہے غلط ہی ہو۔ خاک سمجھیں گے یہ جاہل! سید سمجھ کے شاید کچھ نذر ہی دیں۔ لیکن یہ کچھ بودا سا سوانگ ہوگا پھر۔ پھر ـــ ہاں یہ ٹھیک ہوگا۔ کہہ دونگا میں مسلم لیگ کا کارکن ہوں اور شاہدرہ سے اپنا کام ختم کرکے لوٹ رہا ہوں۔ لیکن......

اب وہ لوگ نزدیک آگئے اور تاجور سامری امید و بیم میں پسنے لگا۔ لیکن وہ لوگ اپنی دھن میں چپکے سے اُس کے پاس سے نکل گئے۔ معلوم ہوتا تھا ان کو فسادات کا کچھ علم ہی نہیں۔ وہ اپنے چہرے پر ایک سکون لئے ہوئے تھے ـــــــ تاجور سامری اس آسانی سے اپنے کو بچتے پا کر خوش ہو گیا اور مقبرے کی طرف چل پڑا۔ لیکن جُوں جُوں قدم آگے بڑھتا خوف اور بے اعتمادی اس پر چھاتے چلے جاتے۔ یہاں تک کہ آخر مقبرے کے پاس سے ہوتی ہوئی سڑک پر کنارے آکر رک گیا۔ اب پھر اس کے دل و دماغ بحرانی عالم میں ڈگمگانے لگے۔ لاہور کیونکر پہنچا جائیگا۔ یہ کرفیو بھی کیا مصیبت ہے۔ کمبخت انگریز کو جو بھی سوجھتی ہے اوٹ پٹانگ۔ اب بھلا اس کرفیو کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے پہلے کیا کم پابندیاں تھیں! تھوڑی مصیبتیں تھیں! کرفیو لگایا تھا۔ تو بسوں اور لاری موٹروں کے لئے گنجائش رکھ لی ہوتی۔ اب مجھ جیسے لوگ جن کو وقت کے گرگٹ پن کا علم نہیں خواہ مخواہ موت کو گلے کا ہار بنا ئیں۔ اب اسے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔ کہ وہ لاہور آیا ہی کیوں؟ جب ماں اور بہن نے اسے اس سفر سے روکا تھا تو وہ کیوں نہ مان گیا؟ اور جب خالصہ کالج کے پاس آکر لاری کا انجن خراب ہو گیا تھا تو خراب ہی رہتا ـــ ٹھیک نہ ہوتا تو اس مصیبت سے تو نجات ملتی" اور پھر یہ دوسری حماقت۔ جوش میں آکر لاری میں سے اُتر آیا بیٹھا رہتا۔ زیادہ سے زیادہ لائلپور لوٹ جانا پڑتا۔ مگر اس مصیبت سے تو نجات ملتی۔ یہ مصیبت فساد۔ کرفیو، ایک تھوڑی ہے۔ اچانک وہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ مقبرے کے بڑے دروانے

میں ایک بوڑھا شخص کھڑا اسے پُرا سرار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ارے تو کیا اس نے مجھے پہچان لیا کہ یہ ہندو ہے؟ اگر یہ نہیں تو وہ مجھے یوں گھور گھور کر کیوں دیکھ رہا ہے۔ اگرچہ وہ خالی ہاتھ ہے۔ لیکن کیا اعتبار ——— تاجور سامری وسوسوں اور دہشت میں گھرا ہوا تھا رہا تھا۔ اچانک اسکو اپنے پاؤں تلے کی زمین نکلتی محسوس ہوئی اور اس نے خوف کے عالم میں چیخنے کی کوشش کی لیکن گلا خشک ہو گیا تھا۔ اس کا چیخنے کا ارادہ ایک خیال بنکر رہ گیا۔ وہ بڈھا اسکے پاس آ گیا تھا۔ بلکہ پاس آکر اس نے پکارا بھی ——— اجنبی! ——— دوسری بار ذرا رازدار لہجے میں، مسافر!

تاجور سامری نے بولنے کی کوشش کی لیکن نطق نے ساتھ نہ دیا۔ وہ بڈھا پھر بولا۔ یہاں بے سُود کھڑے ہو مسافر! کوئی موٹر کوئی لاری یہاں سے آج نہیں گزرے گی۔ آج کرفیو کا دن ہے سارے لاہور میں۔ آدمی سے لے کر تانگہ موٹر تک سب پر کرفیو کا راج ہے۔۔۔۔ تھوڑی دیر کے توقف بعد وہ ذرا قریب آکر اور اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا "تم ہندو جان پڑتے ہو مسافر!"

تاجور سامری پر اب ایک بار پھر لرزا چھا گیا۔ ارے یہ تو یقیناً مجھے پہچان گیا!! پھر پھر اب اب کیا ہوگا؟ یقیناً چھرا یا برچھی اور۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں موند لیں۔ بڈھے نے پھر کہا۔ نوجوان! ڈرو نہیں۔ میں مسلمان ضرور ہوں لیکن گنڈا نہیں۔ بے رحم نہیں۔ انسان ہوں۔ تم آؤ میرے ساتھ، میں یہاں کا متولی ہوں میرے پاس محفوظ رہو گے۔ کل صبح کرفیو ختم ہوتے ہی میں تمہیں پہلی بس پر بھجوا دوں گا ——— سمجھے ——— آؤ گھبراؤ مت۔

تاجور سامری اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ اب شبہ نے پھر اس کے ذہن میں انگڑائی لی۔ یہ یقیناً فریب ہے ——— یہ بڈھا عیار معلوم ہوتا ہے۔ بولنے کا انداز دیکھو تو کتنا میٹھا ہے! لیکن اسکے

دل میں! اسے آج سے تین مہینے پہلے رتن چند تالاب کے سکھ چوکیدار کی وہ بات یاد آ گئی۔ اس نے کہا تھا مسلمان پیدائشی جھوٹا ہے۔ گورو صاحب نے فرمایا تھا مسلمان کے نمبر پر جھوٹ شامل ہے۔ یقیناً یہ سچ ہے۔ وہ چوکیدار غلط نہیں کہتا تھا۔ کیونکہ یہ گورو کی بانی تھی۔ اور گورو بانی جھوٹ کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ بڈھا ضرور سازشی ہے۔ مجھے اپنے ساتھ لے جائیگا اندر اور چپکے سے مروا دے گا اس نے ضرور اپنے حجرے میں مسلح گنڈے چھپا رکھے ہونگے! لیکن اس کے خیال نے پھر پلٹا کھایا۔ اگر وہ مروانا چاہے تو یہاں اس کو کون روکتا ہے۔ یہاں ایک ہندو کو مارنے کے لئے چند گنڈے کس طرح روکے جا سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ واقعی کوئی خضر ہو۔ کوئی فرشتہ! اس قحط کے زمانے میں شاید یہ بوسیدہ مقبرہ ہی ایسا خزانہ ہو جس میں انسانیت کا یہ ہیرا ایک طرف پڑا ہو۔——— تاجور سامری کا بھروسا اب بحال ہو چکا تھا۔ خوف دل کے ایک کونے میں مسکرا کر رہ گیا تھا۔ بڈھے نے پھر شانہ ہلایا۔ کیا سوچتے ہو نوجوان! کیا مجھ پر اعتماد نہیں میری سفید ڈاڑھی میرا خلوص۔۔۔۔۔۔۔

تاجور سامری نے جلدی سے کہا، آپ کے خلوص کی قدر کرتا ہوں۔ مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ چلئے لے چلئے مجھے! یہ کہہ کر وہ اس بڈھے کے ساتھ چل پڑا مقبرے کا صدر دروازہ بوسیدگی اور کہنگی کے باوجود اپنی قدیم شوکت اور رعب قائم رکھتا تھا تاجور سامری خیال ہی خیال میں جہانگیر کے عہد حکومت میں جا پہنچا تھا۔ اس کے دربار کے ارد گرد منڈلا رہا تھا۔ اچانک بڈھے نے اس کا سلسلہ خیال توڑ دیا۔ جہانگیر بادشاہ کے سائے میں تمہارا کوئی بال بیکا بھی نہ کر سکے گا۔ تم بے خوف ہو کر اس چارپائی پر بیٹھو میں تمہارا کچھ انتظام کروں۔۔۔۔۔۔ یہ کہہ کر وہ ایک طرف کے کمرے میں گم ہو گیا۔ تاجور سامری بھی خوفناک وسوسوں میں غرق ہو گیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کو فریب دیکر

یہاں لایا گیا ہے اور یہاں سب کچھ چھین کر اُسے قتل کر دیا جائیگا۔ وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ اُف! وہ بڈھا کیا کہہ کر گیا تھا۔ میں تمہارا کچھ انتظام کروں؟ ان الفاظ کا کیا مطلب ہے؟ کیا وہ مجھے ٹھکانے لگانے کا انتظام کرنے گیا ہے۔ چھت کے ایک کونے سے کوئی بُولا غرغوں! ایک چمگادڑ اندھیرے سے اڑی اور روشنی سے گھبرا کر پھر اسی اندھیرے میں بھاگ گئی! کبوتر پھر پراسرار طور پر پکارا۔ غرغوں۔ غرغوں۔ تاجور سامری سہم گیا۔ کیسی بھیانک جگہ ہے۔ یہ بڈھا کیوں کر اس ویران مقبرے میں رہتا ہوگا۔ کیا یہ جن پریوں کا عمل جانتا ہے؟ یا کوئی خاص افسوں سادھ رہا ہے۔ جبھی تو وہ رہتا ہوگا اس ویرانی میں ——— پیروں کی آہٹ سے اس کے خیالات پھر بکھر گئے۔ آنکھ اٹھائی تو اُس بڈھے کو پایا ——— وہ بولا "خدا نے تمہاری مدد کی اٹھو بس تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ "بس"! تاجور سامری حیرت سے بولا۔ اسے ایک اتفاق سمجھو اجنبی! تمہیں لاہور پہنچنا تھا۔ کارساز نے کام بنا دیا۔ اس نے میرے بڑھاپے کی لاج رکھ لی۔ اٹھو دیر کا وقت نہیں۔ بس ایک سرکاری کام سے شاہدرہ گئی تھی اب لاہور جا رہی ہے کنڈکٹر میرا ملنے والا تھا۔ گزرتے ہوئے پانی پینے کو میرے پاس رک گیا" ——— تاجور سامری حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔

تم حیرانی سے مجھے کیوں دیکھ رہے ہو۔ جب وہ یہاں سے گزرا تھا تو تم اپنی سوچوں میں غرق تھے۔ اتنے میں خاکی وردی پہنے ایک شخص باہر سے آیا۔ کہنے لگا آپ کا آدمی تیار نہیں ہوا ابھی باباجی! میں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔

بس اب کوئی دیر نہیں۔ لے جاؤ اسے لیکن اس کا بال بھی بیکا نہ ہو۔ رسُول کا واسطہ دیتا ہوں۔ ہاتھ باندھتا ہوں۔

کنڈکٹر نے لرز کر کہا۔ آپ ناحق گناہ گار کرتے ہیں مجھے۔ آپ ہر طرح خاطر جمع رکھئے

تاجور سامری۔ مجھے گوالمنڈی جانا ہی۔

کنڈکٹر۔ میں آپ کو دیال سنگھ لائبریری کے قریب اتار دونگا۔

بس پھر کیا ہی۔ آگے میں چلا جاؤں گا۔ اچھا قبلہ اب اجازت ہی!

بڈھے نے کہا۔ خدا تمہاری حفاظت کرے۔

تاجور سامری بس میں آ بیٹھا۔ سب مل کر چار آدمی تھے۔ ایک کونے میں ایک مغموم سی سکھ بزرگ سر جھکائے بیٹھے تھے بس چل پڑی اور انہوں نے رونا شروع کیا۔ کنڈکٹر نے کہا۔ سردار جی حوصلہ نہ ہاریئے۔ کیا معلوم قدرت کو کیا منظور ہے۔ کیا عجب آپ کا لڑکا بچ ہی جائے۔

تاجور سامری نے پوچھا ماجرا کیا ہی خاں صاحب!

کنڈکٹر نے جواب دیا۔ ان کا لڑکا ہمارے محکمے میں ملازم ہی۔ ——————

میں نے اسکو کئی بار کہا تھا کہ آجکل ہیرا منڈی سے گزرتے ہوئے رکنے کی کوشش ہی نہ کیا کرو۔ لیکن وہ میری کبھی نہیں مانا چنانچہ آج اس کے چھرا گھونپ دیا کسی گنڈے نے۔

تاجور سامری تو وہ ..... وہ .....

کنڈکٹر نے فوراً بات کو سنبھالتے ہوئے کہا سنا ہی زخم کاری نہیں لگا۔ ڈاکٹر کوشش کریں تو بچ سکتا ہی۔

ڈرائیور بولا۔ ہسپتالوں میں تو آج کل جسے نہ مرنا ہو وہ مر جائیگا۔ ڈاکٹر لوگ بھی تو ایمان چھوڑ بیٹھے ہیں۔

اسی ڈر سے اسے سر گنگا رام ہسپتال میں بھجوایا ہے تاکہ میو ہسپتال میں بچارا مذہبی تعصب یا وقتی انتقام کا شکار نہ ہو جائے۔ کنڈکٹر نے ہمدردی سے کہا۔

نہیں پائے جاتے۔ تاجور سامری کا یہ رپورتاژ ہندوستان کے تقسیم ہونے۔ ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہونے ہی کا حال نہیں بیان کرتا، وہ پس منظر بھی پیش کرتا ہے جس نے ان حالات کو جنم دیا۔

آج یہ سوال ہر گوشے سے اٹھ رہا ہے۔ کہ تقسیم ہند کا مسئلہ سامنے آتے ہی ملک کے مختلف حصوں میں خون کی جو ندیاں بہیں ان کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ایک کتاب کے تعارف میں اس مسئلہ کو حل کرنا، فسادات کا تجزیہ کر کے ذمہ داری اور غیر ذمہ داری کا فیصلہ کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ مناسب۔ لیکن چونکہ اس کے سمجھے بغیر یہ رپورتاژ بھی سمجھ میں نہ آئے گا، اس لئے چند لفظوں میں اس کا ذکر ضروری ہے۔

برطانوی سامراج کی دو سو سالہ غلامی میں ہندوستان نے اس احساس کے سوا اور کچھ نہیں سیکھا کہ اسے آزادی کی ضرورت ہے۔ آزادی کی ضرورت کا احساس اسے اسلئے ہوا کہ ہندوستانی زمین کے ہوتے ہوئے بے گھر تھا۔ کانوں، کھیتوں، باغوں، سمندروں کا مالک ہوتے ہوئے غریب تھا۔ علم کا شوق رکھتے ہوئے جاہل تھا۔ چالیس کروڑ انسانوں کی فوج رکھتے ہوئے کمزور تھا، انسان ہوتے ہوئے جانوروں سے زیادہ ذلیل تھا اس کے کھیت اسے کھانا نہیں دیتے تھے، اس کی محنت اسے پھل نہیں دیتی تھی، اسکی قوت بازو اسے مضبوط نہیں بناتی تھی ——— اس احساس نے اسے بتایا کہ کوئی ہے جس نے اس کی انسانیت چھین لی ہے، جس نے اس میں درندگی کے جذبے پیدا کئے ہیں، جس نے اس کی عقل مفلوج کر دی ہے، جس نے اس کے نقطۂ نظر کو غیر منصفانہ بنا دیا ہے، جس نے اس کی زندگی کو اتنے زہریلے عناصر سے بھر دیا ہے کہ وہ برائی کو برائی جاننے کے باوجود اسے مٹانے کی طاقت نہیں رکھتا ——— غلامی کا یہ احساس

تاجدسامری بولا۔ آپ نیک نیت انسان ہیں۔ آپ جیسے لوگ ابھی موجود ہیں مجھے اسکی حیرانی ہے۔

کنڈکٹر اس مدح سرائی سے جھینپ کر ایک طرف چپکا بیٹھ گیا۔ سردار صاحب کو بھی چارپی بندھ چکی تھی۔ اور وہ کھڑکی سے سر باہر نکال۔ نظارہ میں کھو گئے تھے

بس اب راوی سے گزر رہی تھی۔ اور راوی ایک بڈھے سانپ کی طرح پُل کے کونے کو رینگتی ہوئی۔ اداس۔ اداس ہی جارہی تھی۔ اس کا زور کم ہوچکا تھا۔ اس کے پاس اب ایک نئی راوی ایک انوکھی ندی بہہ نکلی تھی —— خون اور شعلوں کی لہروں والی ندی جو پہلے پنجاب کی دھرتی پر کبھی سنی تک نہیں گئی۔ اب اچانک پنجاب کے دل لاہور سے پھوٹ نکلی تھی۔ جسکو وقت کا خونی ہاتھ ہر لمحہ وسیع اور پر زور کرتا جارہا تھا۔ شاید اس نئی راوی کی غمنی چیخوں اور للکاروں سے پرانی اور کمزور راوی کا زور دب گیا تھا۔ اور اب یہ ایک اضافی سی ایک غیر ضروری سی چیز ہو کر رہ گئی تھی۔

بس تیزی سے سنسان سڑک پر بھاگتی جارہی تھی آج اس خوبصورت اور فراخ شاہراہ پر صرف یہی بس دندنا رہی تھی۔ دور تک میدان صاف دکھائی دیتا تھا۔ کنارے پر البتہ پولیس کے جوان رائفلیں تھامے کھڑے تھے شاید اس بس کو اس بیخوفی سے فرّاٹے بھرتے دیکھکر سٹپٹا رہے تھے —— دریا بھی بہت پیچھے رہ گیا تھا اب وہ سرکلر روڈ سے گزر رہی تھی۔ یہاں سے لاہور کی روائتی رونق شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن اب جیسے یہاں دیو پھر گیا تھا۔ ہر طرف خاموشی اور ویرانگی کا راج تھا۔ بھاٹی کا وہ ہنگامہ زار اب خاموش تھا جہاں روز کھوئے سے کھوا چھلا کرتا تھا۔ تینوں سینما ہاؤس چُپ سادھے سہمے سے ایک دوسرے کو کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اچانک تاجدر سامری چونک اٹھا۔ رُلدو محمد دین شاہیا

والوں کی دکان کے قریب خون میں لتھڑی ہوئی ایک لاش پڑی تھی۔ اور پاس ایک سپاہی رائفل لئے مستعدی سے اس کی حفاظت کر رہا تھا۔ شاید قتل ہونے کے بعد قانون کی نظر میں اس کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ بہرحال قانون اور اس کا نمائندہ اپنا فرض نباہ رہا تھا۔ اور اُف ایک زخمی اور مکتبہ اُردو کے سامنے لکڑی کے جنگلے کے پاس، ایک نوجوان جس کے سفید کپڑے اب اپنے ہی خون سے سُرخ ہو چکے تھے چت پڑا تھا پاس ہی ایک گٹھڑی تھی۔ شاید یہ مسافر تھا کہیں دور سے اپنے کسی پیارے سے ملنے آیا ہوگا۔ اسکو کیا علم تھا اپنے پیارے کے درشن کی جگہ ایک گنڈے کا چمکتا ہوا تیز چھرا مچھلی منڈی کے ایک کونے میں چھپا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دو سپاہی اس کی طرف پیٹھ کئے باتوں میں مشغول تھے۔ ان کی رائفلیں ایک طرف جنگلے کا سہارا لئے کھڑی تھیں۔ اور ..... یہ لوہاری گیٹ کا چوک دور تک انارکلی ویران دکھائی دیتی تھی۔ اڈے پر خاموشی کا عالم تھا نہ جانے وہ گہما گہمی کہاں چلی گئی۔ جو اس مقام کی فطرت تھی۔ اور وہ یہ سیتلا مندر کے گرد پولیس کیوں جمع ہے۔ شاید اس لیٹے ہوئے سانڈ کو منا رہی ہے۔ لیکن یہ تو خون میں لت پت ہے۔ زبان جبڑے کے ایک طرف نکلی لٹک رہی ہے۔ ——— غالباً کسی نے کسی چھرے نے ہندو آدمی نہ ملنے پر ہندو جانور کے خون سے اپنی پیاس بجھائی ہے۔ ہندو جانور؟ ہاں سانڈ ہندو ہی تو ہے۔ ہندو مذہب کی ایک ستون گائے کا بیٹا، یہ تو ایک بہت بڑی اسلامی خدمت ہے۔ وہ چھرا ضرور غازی ہے جس نے اتنی بڑی دینی اور ملی خدمت انجام دی۔

اب بس ہسپتال روڈ سے گزر رہی تھی سرائے کے باہر کی ساری دکانیں بند تھیں آج ملک آصف علی کی دکان بھی بند تھی۔ وہ جگہ جو ادیبوں اور شاعروں کا مرکز تھا جو نہ ہندو ہوتے ہیں نہ مسلمان۔ قانون شکن، آج وہ بھی کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ دکانیں صرف

جلی حرفوں میں یہ لکھا تھا۔ ادب، انسانیت کا سب سے بڑا معاون ہے۔ لیکن آج ادب اور انسانیت دونوں راندے گئے تھے۔ صرف دھرم اور مذہب خدا اور ایشور ہر طرف منہ پھاڑے پھر رہے ہیں۔ ہندو اور مسلمان چھرے اور برچھیوں سے بس انسانیت کی تلاش میں باؤلے کتوں کی طرح سرگرداں تھے۔

تاجور سامری کے خیالات کا سلسلہ اچانک ٹوٹ گیا، کنڈکٹر کہہ رہا تھا۔ اتریئے صاحب آگئی آپ کی منزل۔ بس دیال سنگھ لائبریری کے ساتھ والی گلی کے نزدیک رکی تھی۔ تاجور سامری بغیر کچھ کہے جلدی سے اترا اور گلی میں گھس گیا۔ ساگر ہوٹل کے قریب کھڑے سپاہی کی قانون سے وفاداری کی رگ پھڑک اٹھی وہ بس کی طرف دوڑا لیکن اس کا شکار دور نکل چکا تھا۔ تاجور سامری موڑ پار کر چکا تھا۔ اور بس جا چکی تھی۔ گلی میں بھیانک خاموشی کا سماں تھا۔ وہ جلدی جلدی اپنے دوست امرناتھ کے مکان میں داخل ہو گیا۔ دیوڑھی میں ایک بوڑھا بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بولا ابھی آرہے ہو؟

تاجور سامری نے جواب دیا۔ ہاں۔

کرفیو میں؟ بوڑھے کی حیرت اور بڑھ گئی۔

تاجور سامری زینہ چڑھتے ہوئے جواب دیا۔ ہاں اب وہ اوپر پہنچ چکا تھا

امرناتھ اور اسکے ماں باپ، چھوٹے بھائی بہن اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ تاجور سامری نے بچوں کو پیار کیا اور بڑوں کو پرنام ——— امرناتھ حیرانی سے بولا۔ ارے آپ کہاں؟ تاجور سامری نے مسکرا کر کہا۔ آپ کے پاس۔

میرا مطلب ہے کرفیو نافذ ہوئے تو دو گھنٹے سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ آپ کیوں کر آئے۔ یہ امرناتھ نے مجسم سوال بنکر کہا۔

تاجور سامری نے جواب دیا اسوقت مجھے نہانے دھونے سے بنٹ لینے دیجئے۔ پھر سب

کچھ کہوں گا۔

ماتاجی بولیں۔ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں سامری جی! سُن لینا سب کچھ تھکان تو اتار لینے دو

پتاجی نے بھی انکی تائید کی۔ اور امرناتھ چپکا ہو گیا۔ اور تاجور سامری جلدی سے تولیہ صابن لئے نیچے غسلخانے کو چلا گیا۔

پابندی تو دو منٹ کی بھی بھاری ہوتی ہے۔ یہ بیالیس گھنٹے کی قید تھی۔ اس میں شک نہیں کہ پابندی ویسی تو ہرگز نہیں جیسی جیلوں میں ہوتی ہے۔ لیکن اس سے کم بھی نہ تھی۔ محض قید تھی۔ اپنی گلی میں نکلنا بھی منع تھا۔ پولیس والے گلیوں میں بھی گھس آتے تھے۔ گلی تو ایک طرف اپنی بالکونیوں اور بالاخانوں کی کھڑکیوں میں کھڑے لوگ بھی ان کو قانون شکنی کرتے نظر آتے تھے چنانچہ سپاہی ان کو بھی ڈرا دھمکا کر اپنے گھروں اور کمروں میں گھسنے پر مجبور کرتے تھے۔ لوگ اب تاش۔ شطرنج۔ کیرم سب سے اُکتا چکے تھے۔ وہ باہر نکلنا چاہتے تھے۔ سڑکوں۔ گلیوں اور بازاروں میں والہانہ گھومنا چاہتے تھے۔ وہ اس کے بغیر زندگی پھیکی سمجھ رہے تھے۔ ادھر راتوں کو بچارے اوپر کی منزلوں پر کھڑے کھڑے مختلف محلوں میں بھڑکتی ہوئی آگ کے آسمان بوس شعلوں کو دیکھتے۔ نعروں، جیکاروں، اور چیخوں کو سنتے ہوئے ان کے دماغ بھنا چکے تھے۔ وہ اب ایک دوسرے سے ملکر معلوم کیا چاہتے تھے کہ اس قید کے زمانہ میں کہاں کیا ہوا۔ کس جگہ آگ لگی۔ کون مرا۔ کون لُٹا۔ آج پورے بیالیس گھنٹے کے بعد لوگوں کو آزادی کی سانس لینے کا موقع ملا۔ تاجور سامری اور امرناتھ اس کے پتا اور مکان کے دوسرے رہنے والے بے اختیار گھر سے نکل آئے۔ گلیوں اور کوچوں سے لوگ اس طرح نکلکر باہر سڑک پر جا رہے تھے۔ جیسے برسوں کی قید سے چھٹے ہوں۔ مرجھائے ہوئے چہرے۔ اس آزاد فضا میں کھل گئے۔ نسبت روڈ کی بھیانک خاموشی ایک مرتبہ زندگی میں

بدل گئی ——— تاجور سامری سب سے الگ ہو کر بیٹن روڈ کی طرف نکل گیا۔ یہاں بھی لوگوں کا ایک سیلاب ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ہندو مسلمان اور سکھ سبھی گھوم پھر رہے تھے۔ کہیں کہیں پولیس بھی نظر آجاتی اچانک کوئی پکارا! تاجور سامری صاحب! اس نے پلٹ کر دیکھا۔ برکت علی پینٹر کی دکان کے چبوترے پر مولانا صلاح الدین احمد اور عاشق حسین بٹالوی کھڑے تھے۔ تاجور سامری دوڑ کر ان کے پاس پہنچا۔ مولانا بولے۔ آپ کب سے لاہور میں ہیں؟

تاجور سامری نے جواب دیا۔ ۴۲ گھنٹے سے۔

عاشق صاحب مسکرا کر بولے۔ پورے حسابی ہیں آپ تو۔

تاجور سامری نے کہا۔ یہ تو سیدھی سی بات تھی۔

مولانا نے فرمایا۔ اس طرح گھومنا نہ کیجئے۔ حالات بگڑنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ ہم کئی دنوں بعد گھر سے نکلے ہیں۔ وہ بھی گھومنے پھرنے نہیں اپنے دفتر کی سُدھ لینے۔

تاجور سامری نے کہا آپ تو تنہائی کے عادی ہیں مولانا! مہینوں مطالعہ اور کام میں غرق رہ کر بھی آپ کی طبیعت نہیں اکتاتی لیکن میری آوارگی پسند طبیعت ذرا سی پابندی سے باغی ہو جاتی ہے۔

مولانا نے کہا۔ آیئے اندر بیٹھ کر باتیں کرینگے۔ اگرچہ آپ کو ناگوار گزرے گا۔ لیکن میں آپکا گھومنا پھرنا کم از کم ایسے حالات میں اچھا نہیں سمجھتا۔ یہ کہہ وہ دفتر کی طرف چل پڑے۔ تاجور سامری بھی ایک سعادت مند شاگرد کی طرح ان کے پیچھے۔ بڑے دروازے سے گزر تھوڑی ہی دور ایک کونے میں انکے رسالے ادبی دنیا کا دفتر تھا۔ کوئی کمرہ بھر جگہ ہوگی۔ جسکو انہوں نے دو حصّوں میں بانٹ رکھا تھا۔ ایک میں رسالے کا منیجر بیٹھتا اور دوسرے میں ان کی نشست تھی۔ یہ سب اندر جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ برقی لیمپ اور پنکھا دونوں بٹن دبانے سے اپنے کام میں لگ گئے۔ اس

کمرے کا ماحول نہایت پُرامن اور خلوص آمیز تھا۔ ایک مرتبہ تو اتنے دنوں کی کوفت سبھی ہوا ہو گئی ـــــ باتیں ہونے لگیں۔ عاشق صاحب کی باتیں مشہور ہیں۔ کوئی موضوع ہو نہ ہو۔ لیکن نیا موضوع پیدا کرنا انکے بائیں ہاتھ کا کرتب ہی لیکن اب تو موضوع سامنے موجود تھا۔ چنانچہ عاشق صاحب گویا ہوئے۔ اب کہیئے مولانا! بنے گا پاکستان کہ نہیں!

مولانا مسکرا کر بولے۔ آپ تو ماہر سیاست ہیں ہو سکتا ہے آپ کو کوئی یقینی راز معلوم ہو چکا ہو۔ میری رائے میں تو انگریز کا چاہا پاکستان یہاں کبھی نہیں بن سکتا۔

انگریز کا چاہا کیا! آپ کے قائدین کا چاہا بلکہ خود آپ کا چاہا پاکستان بنا سمجھئے۔ اور اگر فسادات کی رفتار اسی تیزی سے بڑھتی رہی! ہندو اور مسلمان اندھا دھند تعصب اور انتقام سے پیٹتے رہے تو میری پیشین گوئی زیادہ سے زیادہ مہینے بھر میں سچ ثابت ہوگی۔ عاشق صاحب یہ کہہ کر سگریٹ سلگانے لگے۔

کیونکر! صرف آپکے کہنے یا میرے مان جانے سے پاکستان کیونکر ممکن ہوا۔ لیڈر بھی مانیں گاندھی اور جواہر تو جان دیدینگے مگر ملک کے ٹکڑے نہیں ہونے دینگے۔ میرا تو یہی خیال ہے آگے آپ جائیں۔ مولانا یہ کہہ کر کہ اپنی چمکتی چاند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تاجور سامری کی طرف دیکھنے لگے۔

تاجور سامری بولا۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ نہرو اور گاندھی تو خواب میں بھی ایسا نہیں کر سکتے!

آپ کیا جانیں تاجور صاحب! ان لیڈروں کے من کی! یہ گرگٹ! اپنی بات ہاتھ سے جاتی دیکھکر سب کچھ مان جائینگے۔ قائداعظم تو خیر بدنام ہی ہیں۔ صاف گوئی اور ثابت قدمی کے لئے اب دیکھنا ذرا کانگریس کے نیتا کیا کرتے ہیں ـــــ عاشق صاحب یہ کہہ کر اپنا بجھا ہوا

سگریٹ سلگانیکے بعد منہ سے دھواں چھوڑتے ہوئے بولے! کانگریس کی ملک سے وفاداری اور سیاسی سوجھ بوجھ کا اندازہ اس سے ہی لگالیجیے۔ ملک خضر حیات کو ایسے وقت میں دھوکا دیا کہ بچارے کہیں نہ رہے۔ ورنہ جس طرح اتنی مخالفت کے باوجود اپنے ارادے پر قائم رہے تھے اگر ان کے ساتھی ان کا ساتھ نہ چھوڑتے تو آج لاہور کی حالت یہ نہ ہوتی۔ وہ سچر اور سورن سنگھ سے صاف کہتے رہے کہ مسلم لیگ کی اس تنظیم اور پُرامن جلوسوں میں یقیناً انگریز کا ہاتھ ہے۔ تم انکے جلوس میں گڑبڑ ڈالدو۔ ہندو مسلم فساد کراؤ۔ میں ابھی اس بڑھتے ہوئے زور کو ختم کردونگا لیکن وہ ہنسا کے پجاری ٹس سے مس نہ ہوئے، اور آخر خضر کو دوسری طرف صاف جھکنا پڑا۔ اب تو کوئی دن جاتا ہے آپ دیکھیں گے ہندوؤں کو لاہور چھوڑتے ہوئے۔ اور دہلی یوپی کے مسلمانوں کو آتے ہوئے۔

مولانا کانپ کر بولے۔ آپ کی پیشین گوئی خوفناک تو ضرور ہے لیکن ہے پیغمبرانہ شان کی لیکن سُن لیجیے میں ایسا پاکستان نہیں چاہتا۔ جس میں موجودہ کلچر کا شائبہ تک نہ رہے۔

آپ کو کون پوچھے گا مولانا! عاشق صاحب کے لہجے میں ذرا تلخی تھی، انگریز یہ نہیں چاہے گا کہ پاکستان میں ہندو مسلمان مل جلکر رہ سکیں۔ کیونکہ اس سے اس کا سارا خواب ریت کی دیوار کی طرح گر کر رہ جائیگا۔ ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے غلام رکھنے اور اسے کمزور رکھنے کیلئے خاص پاکستان بننا ضروری ہے۔

مجھے آپ سے ڈر لگتا ہے عاشق صاحب! مولانا سہم کر بولے۔

سچ سے کیا ڈرنا! ہم سب تو کھلونے ہیں انگریز کے۔ آپ دیکھ نہیں رہے کہ دونوں صوبوں کے سرکاری عہدے دار اپنے اپنے طور پر کتنے سرگرم ہیں۔ جیسے صاحب کے متعلق جو افواہیں ہندو اڑا رہے ہیں وہ بھی غلط نہیں۔"

آپ نہایت خوفناک آدمی ہیں مجھے یہاں اب خوف محسوس ہونے لگا ہے آپ چائے پئیں گے تاجور صاحب! مولانا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

تاجور سامری نے کہا۔ جی آپ میری عادتوں سے واقف ہی ہیں چائے سے مجھے لگاؤ نہیں۔ آپ تو پئیں گے عاشق صاحب! آیئے چلیں ذرا کیفے۔ مولانا باہر نکلے کمرے سے۔

عاشق صاحب اور تاجور سامری چپکے چپکے ان کے پیچھے آ گئے۔ بازار میں خاصی چہل پہل تھی۔ لیکن دکانیں بند تھیں۔ تانگے آ جا رہے تھے۔ مولانا نے ایک تانگے والے کو رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ رک گیا۔ عاشق صاحب اور مولانا اس میں بیٹھ گئے۔ تاجور سامری ان سے رخصت ہو کر مکلوڈ روڈ کی طرف لوٹا۔

مکلوڈ اور نسبت روڈ کے سنگم پر بے پناہ ٹریفک تھا۔ تاجور سامری ایک طرف کھڑا بھیڑ چھٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک کسی نے آواز دی۔ سامری صاحب! آواز مانوس تھی۔ اس نے آنکھ اٹھائی تو مرکنٹائل پریس والے ہریش چندر کو تانگے پر اپنا منتظر پایا۔ یہاں کیا رہے ہو؟ آ جاؤ جلدی سے ہریش نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ یہاں۔ یہاں تم نے لائلپور سمجھ رکھا ہے؟ آؤ جلدی! تاجور سامری فوراً اسکے پاس اگلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ تانگہ چل پڑا۔ اور یہ دونوں دوست باتیں کرنے لگے۔

ہریش نے آہستگی سے کہا مجھے تمہارے آنے کا پتا کل ہی چل گیا تھا۔ تم ادھر آئے کیوں نہیں۔

تاجور سامری نے ندامت سے کہا۔ آج مولانا سے ملنا تھا۔ کل آپ سے ملنے کا پروگرام تھا

خوب خوب ..... ہریش نے اپنے سارے موٹے پن کا زور لگاتے ہوئے جلدی سے کہا یہ پروگرام کب سے بننے لگے ہیں جی!!

تاجور سامری اس پر جھینپ گیا۔ تانگا اب گوال منڈی میں ان کے مکان کے قریب جا کر رک گیا تھا۔ دونوں اترے اور مرکنٹائل بلڈنگ کے بڑے سے بند پھاٹک کی کھڑکی سے

اندر داخل ہوئے۔ اوپر کے بڑے کمرے میں حسب معمول فرشی محفل جمی تھی۔ ان کو دیکھ کر لالہ دیوان چند چونک کر بولے یہ سامری صاحب یہاں کیسے ؟

ہرلش، بازار سے پکڑ لایا ہوں ان کو۔

بے بے جی مسکرا کر بولیں، "تو سامری نہ ہوئے کوئی ڈھور ڈنگر ہوئے۔ اس پر فرمائشی قہقہہ پڑا اور تاجور سامری جھینپ کر ایک طرف گاؤ تکیے کا سہارا لیکر بیٹھ گیا۔

لالہ دیوان چند نے کہا۔ ارے انکو پانی وانی تو پوچھو، ذرا مہمان کا خیال بھی کیا کرو، لا پردیسی! سکنجبین کا ایک گلاس تاجور سامری کے لئے۔ اسکے بعد پھر باتیں شروع ہو گئیں ایک شخص خاکی نیکر سفید قمیص پہنے ایک طرف بیٹھا تھا۔ سب اسکی طرف زیادہ متوجہ تھے۔ انہو کہا۔ آج پھر چیمبرہمیں چیلنج دیکر گیا ہے کہ میں شاہ عالمی کو جلا کر بھسم کر دونگا۔ تمہاری اکڑ اسی دن ٹوٹے گی جب یہ ہندوؤں کا گڑھ تباہ ہوگا۔

لالہ دیوان چند لرز کر بولے تو پھر تمنے کیا انتظام کیا۔ ڈپٹی کمشنر کو اطلاع دی اسکی؟

وہ شخص، "ہمارا اپنا انتظام حکومت کے آگے کیا معنی رکھتا ہے، آج ہمارے نوجوانوں کا ایک ڈیپوٹیشن صاحب سے ملنے گیا تھا۔ ہماری شکایت پر وہ رکھائی سے بولے۔ اب سمجھاتے کیوں نہیں سوراج کو؟ برسوں سے ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اب کرو جو من میں آئے ہم تو جا رہے ہیں" یہ کہہ کر وہ اٹھ کر اندر چلے گئے۔ اور ڈیپوٹیشن واپس آگیا۔

بے بے جی کانپ کر بولیں، پھر اب کیا ہوگا؟

وہ شخص، "جو کرتار کو منظور ہوگا۔"

ہرلش۔ "کرتار ...... ہوں ..... کوئی آسمان سے فوجیں تو نہیں بھیجے گا۔ آخر تم نے کیا انتظام کیا ہے، اتنا جو وقت ملا تمہیں"۔

وہ شخص ہم نے فائر بریگیڈ والوں کو اطلاع دی ہے۔ ٹیلیفون ہمارے ہر وقت ہاتھ میں ہیں۔ اپنے طور پر پانی اور دوسرے امدادی سامان کی بھی کافی مقدار جمع کر لی ہے۔ اور کیا کریں۔

ہریش: "آپ کو شاید یہ بھول گیا کہ ٹیلیفون اور فائر بریگیڈ والوں میں کثرت مسلمانوں کی ہے۔" وہ شخص "یہ تو معلوم ہے اسی لئے بن پڑے تک انتظام کیا ہی ہے۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہنسراج ڈرائیور نے آ کر اطلاع دی کہ باہر ایک شخص آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔

لالہ دیوان چند، کون ہے وہ ---- پوچھا اس سے! کام کیا ہے؟

ہنسراج - سبزی منڈی کا چودھری، پہلوان ہے اور بھی دو آدمی ہیں۔ کہتے تھے لالہ جی سے ملنا ہے۔

بے بے جی - "خالی ہاتھ تھے وہ"،

"ہنسراج - جی بالکل۔"

ہریش - "وہ ہماری طرح بزدل نہیں - چلو تو ہم بھی چلیں - کوئی کھا تو نہیں جائیگا۔" اس پر سب اٹھ کھڑے ہوئے - بے بے جی نے کہا - ذرا سنبھلکر بات کرنا اور ہنسراج تم آس پاس نگاہ رکھنا ---- لالہ دیوان چند نے کہا - تم گھبراتی کیوں ہو؟ پہلوان اچھا آدمی ہے - دغا نہیں کریگا یہ کہہ کر وہ نیچے اتر آئے - ڈیوڑھی میں ایک بنچ پر تین آدمی بیٹھے تھے ایک موٹا سا لمبے قد کا، غالبا یہی پہلوان تھا - چہرے سے اعتماد اور شرافت جھلکتی تھی۔ دوسرے دونوں جوان شخص تھے ان کی آنکھیں خوفناک انداز سے چمکتی ہوئی بات بات پر گھومتی تھیں - پہلوان نے اٹھ کر خلوص سے لالہ دیوان چند سے ہاتھ ملایا - رسمی آؤ بھگت کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ پہلوان تحمل سے خلوص بھرے لہجے میں کہنے لگا، لالہ جی صاحب آپ تو میری عادت اور طبیعت کو جانتے ہی ہیں

بڑا قیمتی تھا، یہ وہ حربہ تھا جس سے تقدیر بدلی جا سکتی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک جاہل ملک میں یہ احساس ایک عام احساس نہیں بن سکتا تھا۔ تاہم ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو ملک کی غلامی اور مادی حالات کی کشاکش کی روشنی میں ان کے کردار کا مطالعہ کر سکیں چنانچہ جب خود غرض گمراہ اور طبقاتی مفاد کو برقرار اور مستحکم کرنے والے عناصر برطانوی۔ امراج کو پشت پناہ بنا کر آزادی کی جد وجہد کو مختلف راستوں میں بھٹکانے کی کوشش کرتے تھے۔ اسوقت ملک کے ترقی پسند عناصر برطانوی حکومت کے ساتھ ساتھ ان کے حلیفوں اور آزادی کے دشمنوں کا پردہ بھی چاک کرتے تھے۔ وہ عوام جن کی روحیں صدیوں کچلی گئی ہوں، جنھیں تقدیر پرستی کا سبق دیا گیا ہو، جن کے ذہن میں فرقہ پرستی کے جراثیم بھرے گئے ہوں ان کو سبز باغ دکھا کر گمراہ کر دینا ایسی کونسی بڑی بات ہے۔ وہ گمراہ کئے گئے۔ اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ جہاں کہیں انہیں جاہل عوام کو اپنے صالح انسانی شعور سے کام لینے کا موقع ملا، جہاں انھیں بے غرض لوگوں نے صحیح راستہ دکھایا وہاں انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ فطری یا جبلی طور پر بُرے نہیں ہیں، بلکہ حالات نے انھیں بُرا بنا دیا ہے۔ اس لئے اگر فسادات میں کسی مخصوص طبقہ، گروہ، مذہب یا عوام کی ذمہ داری کا اندازہ لگانا ہو تو اس کا فیصلہ کسی باطنی قوت سے نہ ہو سکے گا، بلکہ تاریخ کے عمل اور ردِ عمل میں اس کا سراغ ملے گا اور جب ہم یوں دیکھتے ہیں تو اس سلسلہ میں سب سے اوپر برطانوی سامراج کا نام دکھائی دیتا ہے اور اسکے بعد اس کے حلیفوں اور طبقاتی مفاد کے علمبرداروں کا اور اگر میں نے تاجور سامری کے الفاظ کو صحیح سمجھا ہے تو انھوں نے بھی یہی نتیجہ نکالا ہے۔

تاجور سامری لائلپور (حال مغربی پنجاب میں ہونے کی وجہ سے پاکستان

ہندو مسلمان خواہ مخواہ آپس میں الجھ رہے ہیں۔ تیسرا شخص کھڑا ان کی بیوقوفی سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ میرا تو جینا دوبھر ہو گیا۔ آؤ بھائی ملکر کوئی راہ نکالیں، امن اور سمجھوتہ کی!

لالہ جی نے کہا۔ مجھے تو اس سے خوشی ہو گی لیکن آپ نے اپنے لیڈروں سے بھی رائے لی ہے یا اپنا ہی ارادہ ہے!

پہلوان۔ لیڈروں سے پوچھا تو نہیں لیکن انکو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟

ہرش، صرف ایسا سمجھ لینے سے کام نہیں چلے گا، پوچھ ہی کیوں نہ لیں۔

لالہ جی۔ ٹیلیفون نزدیک ہے۔ نواب محمد وٹ سے دریافت کر لیا جائے۔

پہلوان۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے اگر اسی طرح آپ کی تسلی ہو جائے۔ میں تو امن چاہتا ہوں۔ آیئے پھر ساتھ ہی کے کمرے میں ٹیلیفون ہے آپ کے سامنے سب کچھ طے ہوا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر لالہ جی بڑے کمرے میں آئے ان کے ساتھ دوسرے لوگ تھے۔ لالہ جی نے ریسیور اٹھا کر رنگ کیا۔ ہیلو ہیلو کون صاحب بولی رہی ہیں۔ محمد وٹ! آپ کہاں سے بول رہے ہیں، جواب کے بعد دوسرے نے سوال کیا۔ ٹیلی فون کی آواز صاف تھی۔ پہلوان بھی قریب آکر سن رہے تھے لالہ جی نے کہا۔ میں ڈاکٹر دلاور علی چونے منڈی سے بول رہا ہوں، اچھا، کیا چاہتے ہو؟ دوسری طرف سے پھر سوال کیا گیا۔

لالہ جی نے کہا، یہاں کے ہندو چاہتے ہیں کہ ہم ان کے ساتھ ملکر امن کمیٹی بنائیں! آپ کی کیا رائے ہے؟

اس پر دوسری طرف ذرا دیر خاموشی رہی۔ اور ادھر سب اس فیصلہ کے لئے سراپا گوش بنے تھے۔ میرا خیال ہے ڈاکٹر صاحب! دوسری طرف سے آواز آئی۔ تم لوگ بظاہر بیشک مل جاؤ ان سے لیکن باطنی طور پر الگ ہی رہنے میں بہتری ہے۔ سمجھے! پاکستان کس طرح بنے گا

اگر تم نے بھی امن پسندی اختیار کر لی۔

پہلوان کا یہ سنکر چہرہ دھندلا پڑ گیا۔ لالہ جی بولے اب کیا ارادہ ہے آپ کا۔ اکیلے آپ امن قائم رکھ سکتے ہیں۔

پہلوان مایوسی کے انداز میں اٹھتے ہوئے بولا۔ ہماری بدقسمتی ہے۔ لالہ جی! یہ لیڈر ہماری تباہی کر کے ہی رہیں گے، میں شرمندہ ہوں آپ سے لالہ جی۔ یہ کہتے ہوئے پہلوان کا گلا رندھ گیا آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

لالہ جی بولے۔ مجھے آپ کے خلوص پر کبھی شبہ نہیں ہوا۔ میری طرف سے آپ خاطر جمع رکھیے رہی امن کمیٹی، اس کے لئے میں معذور ہوں۔ آپ کی اس تکلیف اور ہمدردی کا شکریہ!

دونوں بڑے افسوس اور مایوسی کے عالم میں جدا ہوئے۔ کرفیو کا وقت ہو چلا تھا۔ تاجور سامری جلدی سے سندر داس سٹریٹ کو اپنے ٹھکانے کے لئے چل پڑا۔

آگ اور دھواں شعلے اور دھماکے۔ دور تک ایک قیامت کا سماں۔ چیخ پکار ہائے وائے کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ تاجور سامری ایک اونچی سی چٹان پر کھڑا اس قیامت میں کھویا سا تھا اچانک امرناتھ نے اسے بازو سے آپکڑا اور کھینچتے ہوئے کہنے لگا بھاگو، بھاگو، آنکھ کھل گئی، امرناتھ اسپر جھکا ہوا اسی جگا رہا تھا۔ اور تاجور سامری کا دل اس بھیانک خواب کی دہشت سے دھڑک رہا تھا۔ اسکی کھوئی کھوئی سی نظریں دیکھکر امرناتھ نے کہا۔ پسنا تو نہیں دیکھ رہے تھے کوئی! تاجور سامری اسی کھوئے سے انداز میں بولا وہ آگ کا جنگل وہ قیامت،

امرناتھ بولا۔ اٹھئے، دیکھئے آگ۔ آج تو لاہور کے اردگرد سینکڑوں جوالا مکھی نظر آرہے ہیں۔ اٹھ کر دیکھئے نا!

ماتاجی نے پکارا۔ سامری جی دیکھیے آگ، اس کے آگے وہ ڈر کے مارے کچھ نہ کہہ سکیں۔

تاجور سامری اب ہوش میں آچکا تھا۔ اس نے اٹھکر دیکھا سارا لاہور اونچی چھتوں پر آگیا تھا اور ہر طرف بھیانک آگ آسمان کو چھو رہی تھی، اور لوگوں کا شور۔ گولیوں اور دھماکوں سے قیامت کا سماں چھا رہا تھا، کہیں کہیں آگ کے غبارے اڑتے نظر آتے تھے۔

امرناتھ بولا، یہ پٹرول اور مٹی کے تیل میں بھگوئے ہوئے گولے ہیں جنکو آگ لگا کر ایک دوسرے پر پھینکا جا رہا ہے۔

کرشنا بالی اوم اور ننھی سودیش کبھی ڈر کر چادر میں منہ لپیٹ لیتے اور پھر اٹھ کر دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ پتاجی ایک طرف خاموش کھڑے اس طوفان کو ناچتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ اچانک ایک طرف سے شعلے زیادہ خوفناک اور بھرپور انداز میں آسمان پر لپکنے لگے۔ اور لوگوں کا دردناک شور پہلے سے کئی گنا زیادہ ہوگیا۔

پڑوس سے ایک آدمی کی آواز آئی یہ کوئی نئی آگ لگی ہے؟ کس جگہ ہے یہ معلوم نہیں ہوتا پتاجی چونک کر بولے۔ ذرا آگے آواز پہنچا کر بتا چلاؤ کہاں آگ لگی ہے؟

اب یہ آواز کی ڈاک چلنے لگی۔ دور سے کوئی پکارا آگ شاہ عالمی کی طرف لگی معلوم ہوتی ہے۔ تاجور سامری کا ماتھا ٹھنکا، اور پتاجی سے کہنے لگا۔ مجھے کل ہی شاہ عالمی کے ایک شخص سے پتا چلا تھا کہ چیمہ صاحب نے آگ لگانیکی دھمکی دی ہے۔ سو وہ آج عملی صورت میں نظر آگئی ہے۔ ماتاجی لرزنے لگیں، اور کہا۔ ہائے ہم کہیں کے نہ رہے کیا کریں ہم۔ کدھر جائیں گے بھگوان سہا ہتا کر۔ پتاجی نے دھیرے سے کہا گھبرانے کی کیا بات ہے۔ بھگوان بھلا کرے گا۔ میں انتظام کر رہا ہوں نکلنے کا۔

ماتاجی رونکھی ہو کر بولیں کب! جب آگ ہمارے گھر کو نگلنے لگی گی۔

اجی رام رام کہو۔ ایسا نہیں ہوگا۔ پتاجی یہ کہہ کر گاتری پاٹھ کرنے لگے۔

اب گولیوں کی آوازیں تیز ہونے لگیں۔ ساتھ ہی مرنے اور زخمی ہونیوالوں کی چیخ و پکار۔ پڑوس سے آواز آئی۔ لوگ بچنے کی کوشش میں گھروں سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں شاید دوسری آواز۔ اور قانون اپنے کھوکھلے وقار کی حفاظت کے لئے انہیں ایسا حق نہیں دیسکتا۔ اس لئے گولیوں کی بوچھاڑ سے کرفیو کے حکم پر عمل کر رہا ہے۔"

اتنے میں نچلی منزل میں رہنے والا بوڑھا پنڈت اوپر آیا، اور کہنے لگا۔ شاہ عالمی کو چیمسنے پٹرول ڈالکر آگ لگوادی ہے۔ لوگ آگ سے بچنے کے لئے گھروں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں تو مسلمان پولیس انہیں گولیوں سے بھون رہی ہے۔

آپ کو کیونکر پتا چلا۔ پتاجی بولے۔

بوڑھا پنڈت۔ "ابھی ابھی ڈاکٹر صاحب کے ہاں فون آیا ہے شاہ عالمی سیوا سمتی سے کہ اگر کچھ کر سکتے ہو تو کرو۔ ہم موت کے منہ میں ہیں۔"

ماتاجی رونے لگیں اور ساتھ ہی کرشنا اور دوسرے بچے بھی۔ پتاجی غمگین ہو کر کہنے لگے۔ "سامر بھاجی آپ ان کو سمجھایئے۔ اس طرح رو رو کر یہ میرے ہاتھ پیر پھلا دینگے۔

تاجور سامری نے کہا۔ ماتاجی ایسا بھی کیا ڈرنا! ابھی خطرہ بہت دور ہے۔ میری رائے میں آپ کل نہیں تو پرسوں دہلی چلئے۔ میں بھی چلوں گا۔ آپ کے ساتھ!

ماتاجی خوش ہو کر بولیں۔ یہ تو آپ کہتے ہیں نا! اپنے پتاجی سے بھی مشورہ لیا!

تاجور سامری نے کہا۔ میں نے ان کے من کی آپ کو کہی ہے۔ اب گھر جانے سے کام بگڑنے کا اندیشہ ہے۔

پتاجی بولے بس اب کل چلنے کی تیاری کرو۔ سامان ضرورت کا باندھنا! میں اب کل

کے بعد ایک لمحہ یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ یہ سن کر سب خوش ہو گئے، اور امرناتھ نے چپکے سے تاجور سامری کا ہاتھ دبا کر دھیرے سے کہا۔ واہ رے استاد۔

تاجور سامری نے مصنوعی رعب سے کہا۔ اب جسکو نیند آتی ہو سو جائے۔ جو آگ کا تماشا دیکھنا چاہے دیکھے۔ اب اگر کوئی رویا تو دہلی کا ارادہ منسوخ سمجھو۔ سب اس ایکٹنگ پر ہنس پڑے اور اس کے بعد بچے تو لیٹ گئے۔ تاجی دہلی کے خیالوں میں کھاٹ پر اونگھ گئیں۔ تاجور سامری اپنے خیالوں میں مگن ہو گیا۔ اور تیاجی خاموش آگ کے نظارے میں نگاہیں گاڑے رہے۔ امرناتھ بھی تھک کر اپنی کھاٹ پر لیٹ گیا۔

کرفیو ختم ہوتے ہی سارا لاہور پر تولنے لگا۔ سڑکوں پر بستروں ٹرنکوں اور عورتوں بچوں سے لدے پھندے تانگے اسٹیشن کی طرف جاتے نظر آنے لگے۔ ایک لمبی قطار ایک نہ ختم ہونیوالا سلسلہ آگ، چھرے اور گولی کے ڈر سے سہمے ہوئے چہرے، موجودہ زندگی سے اچانک ایک نئے دور میں داخل ہونیکے تصوروں میں ڈوبے چہرے، اور سڑکوں سے ذرا ہٹ کر مسلمانوں کے ٹوٹے خاموش اور حیران، فاتح اور مطمئن چہروں والے لوگ، ان جانیوالوں کو دیکھ رہے تھے۔ مسلسل تنکے جا رہے تھے اور جانیوالے ایک خوف ایک بھیانک دھچکے کے خطرے سے کانپتے ہوئے تانگوں پر بہتے جا رہے تھے۔ ان کو ہر طرف ہر آنکھ میں ایک چھرا، ایک برچھی جھلکتی دکھائی دیتی، اور دیکھنے والو کی مطمئن آنکھیں اور فاتح چہرے خاموشی کی زبان سے کہہ رہے تھے۔ یہ جا رہے ہیں۔ ہم سے ہار کر بھاگے جا رہے ہیں۔ اب ان بھگوڑوں پر ہاتھ اٹھانے سے حاصل؟ ان کو جانے دو، ان کی جائداد ان کے مکان، آخر ہمارے ہی تو ہیں اب، یہ جا رہی ہیں سب کچھ چھوڑ کر۔ چلو سستے چھوٹے۔ نہیں دینگے پاکستان! کیونکر نہیں دینگے؟ اب دیا کہ نہیں؟ سالے ..... یہ

سب کچھ آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ مسکراہٹیں کہہ رہی تھیں اور ان کے چہروں کی سرخی یہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔

اسی سلسلے میں تین تانگے سامان اور سواریوں سے بھرے ہوئے جا رہے تھے! اگلے تانگے میں تاجور سامری اور احمد بخش، بیچ والے میں ماتا جی اور بچے اور آخر میں پتا جی اور امرناتھ بیٹھے تھے بچے چاروں طرف حیرت سے سرخروئی سے دیکھتے تھے ماتا جی کسی گہری سوچ میں غرق تھیں۔ امرناتھ اور پتا جی اگلی منزل کے متعلق تجویزیں طے کر رہے تھے۔ اور سب سے اگلے تانگے میں احمد بخش کہہ رہا تھا، یہ سب کچھ ہونا ہی تھا تاجور صاحب! یہ جو ہوا۔ مہینوں سے طے تھا۔ انگریز ڈپٹی کمشنر کے ایما ہی پر ساری سازش رچی گئی۔ ورنہ جمیہ صاحب کی مجال تھی کہ یوں کھلے بندوں نادر گردی کا کام لیتا، میں جو کئی دن سے دتا جی کے پاس گانا سیکھنے نہیں آیا۔ اس کا کارن یہ تھا کہ میری ڈیوٹی جمیہ صاحب نے اپنے پاس لگوائی تھی۔ پرسوں شاہ عالمی کے خونی کھیل میں بھی میں ان کے ساتھ تھا۔

تاجور سامری بولا جب آپ کو اتنا کچھ عرصے سے معلوم تھا ہمیں کیوں نہ بتایا۔ شاید کوئی پیش بندی کر ہی لی جاتی۔

احمد بخش نے دکھ کے ساتھ کہا۔ آج تک میں نے کونسا بھید آپ سے چھپایا۔ محلہ سرین کی تباہی کی سازش کے بارے میں بھی میں پہلے ہی بتا گیا تھا۔ اس بات کے کہنے کا تو موقع ہی نہیں مل سکا۔ پرسوں اچانک میری طلبی ہوئی اور پھر دوسرے دن لوٹ سکا ہوں گھر۔ سچ تو یہ ہے میری طبیعت ٹھکانے نہیں تھی۔ اتنی تباہی دیکھ کر مجھے اپنے پاگل ہونے کا خطرہ تھا۔ پڑا رہا گھر میں چپکا۔ آج ذرا مزاج سنبھلا تو دتا جی کے ہاں پہنچا۔ پتا چلا کہ آپ سب جا رہے ہیں۔ اگر میں وہیں رک جاتا تو درشن ہی نہ ہوتے، ہائے اب یہ آنکھیں کہاں دیکھوں گا۔ پنجاب کا دل لاہور

سونا ہورہا ہے۔ محفلیں اُجڑ رہی ہیں۔ فن کار جا رہے ہیں۔ میں سوچتا ہوں اجڑا ہوا لاہور کتنا بھیانک ہوگا پنجاب کے بانکے مصور سردار جسونت سنگھ بھی گئے۔ ان کی جگہ پُر ہونی مشکل۔ دتّا جی بھی چلے جائیں گے اداسی اور بڑھ جائیگی یہ کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا۔

چیمہ صاحب نے میرے سامنے موٹر سے پاپڑ منڈی میں پٹرول چھڑکوایا۔ بازار کی بجلی کا فیوز اڑا دیا گیا تھا۔ محلے کے ایک جانباز نے تیا چلنے پر جب کھمبے پر چڑھ کر فیوز لگایا۔ اور روشنی ہوئی تو چیمہ صاحب اور میرے علاوہ اور بہت سی سپاہی وہاں کھڑے تھے۔ چیمہ صاحب کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور میری رائفل چھین کر اس نوجوان کو نیچے گرا لیا۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اور پھر آہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس اندھیرے میں شعلے بھڑکنے لگے اور جب مکانوں سے لوگ گھبرا کر نکلے تو پولیس کی گولیوں نے ان کو لوٹ جانے پر مجبور کیا۔ دونوں طرف موت منہ کھولے کھڑی تھی کیا کرتے۔ بچارے مرنے لگے۔

نل بند تھے نالیاں، کیچڑ، مگر نوجوانوں نے آگ پر قابو پانے کا تہیہ کر لیا لیکن کیوں کر! میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب وہیں گولیوں سے ڈھیر ہو گئے۔ جلتے مکانوں سے رونے چیخنے اور پکارنے کی آوازیں دھوئیں اور شعلوں کی سرسر کڑکڑ میں ملکر اور بھی بھیانک ہو رہی تھیں۔ کیا بتاؤں، تاجور صاحب وہ رات قیامت کی رات تھی۔ میں گویا جاگتے میں سو گیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے پھر وہ ڈوب سا گیا۔

تانگوں کا یہ طویل قافلہ اسٹیشن کے احاطہ میں داخل ہوا۔ ہر طرف بستروں اور ٹرنکوں اور سوٹکیسوں کے انبار لگے تھے۔ عورتیں بچے جوان بوڑھے۔ ٹھٹ کے ٹھٹ ہر طرف نظر آتے تھے اس بھیڑ بھاڑ میں یہ نئے آنے والے بھی دھیرے دھیرے سمانے لگے۔ احمد بخش رخصت ہوا تو تاجور سامری ایک طرف بیٹھ گیا۔ افراتفری کے نظارے میں نہ جانے کب تک کھویا رہتا کہ تیا جی نے

آکر کہا۔ دیکھیے سامری جی دہلی جانیوالی گاڑی آگئی۔ اور تاجور سامری اسی کھوئے سے انداز میں سامان اٹھائے ہوئے قلیوں کے پیچھے سب کے ساتھ چل پڑا۔

تقریباً سارا پنجاب فساد کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ قتل۔ آگ اور لوٹ کھسوٹ تیزی سے ایک طوفانی لاوے کی طرح چاروں طرف بڑھے چلے آرہے تھے۔ گنڈوں کی چاندی تھی۔ لیڈروں کی من مانی ہو رہی تھی۔ لیکن لوگ اس مصیبت سے اُوب گئے تھے۔ وہ زندگی کے اس بھیانک نظارے سے تھک گئے تھے۔ بڑے بڑے شہروں کا کاروبار اور رونق لگاتار کرفیو کی بھاری اور سیہ چادر تلے دب کر رہ گئی تھی اور اسی وقت ملک کی قسمت کے مالک عارضی حکومت کی کرسیوں سے بُری طرح چمٹے تھے گاندھی اپنی اندر کی آواز اور ایشور کے حکم کے بغیر پنجاب کے دکھ کے متعلق سوچنے سے بھی معذور تھے پنڈت کے کندھوں پر ہند کی وزارت عظمیٰ کا بوجھ اس طرح آپڑا تھا کہ وہ بچارے کچھ نہ کرنے پر مجبور تھے۔ البتہ زبان سے ضرور کہتے تھے کہ مجھے پنجاب والوں کے دکھ سے بڑی روحانی کوفت ہوتی ہے۔ پنجاب کی آگ کی لپٹیں میری رُوح کو جھلسا رہی ہیں۔ لیکن کیا کروں؟ حکومت نہیں چھوڑتی۔ چنانچہ اب لوگ مایوس ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

تاجور سامری دیرہ دون اور دہلی کا چکر کاٹ کر کئی دن بعد لائلپور پہنچا۔ یہاں آکر اسے ایسا محسوس ہوا مانو کسی پرامن جزیرے میں آگیا ہو۔ فسادات کا کوئی اثر یہاں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لوگ باگ پہلے کی طرح اپنے دھندوں میں بیفکری اور دلجمعی سے لگے ہوئے تھے۔ رات دن بازاروں میں رونق۔ سینما گھروں میں بھیڑ، اور صبح شام باغوں اور سیرگاہوں میں بیخوف سیلانیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ چہکتے نظر آتے۔ ریل بازار، گھنٹہ گھر سے لیکر اسٹیشن تک چہکار رہتا بھوانہ بازار اور کچہری بازار اس طرح لگے جیسے دو پریمیوں کی محبت بھری آنکھیں ایک دوسرے میں جذب ہو کر رہ گئیں ہوں۔ ہر طرف ایک ایسا سماں چھایا تھا کہ کسی قسم کا کھٹکا محسوس ہی نہیں ہوتا تھا

شہر کے رہنے والے ابھی لاہور۔ راولپنڈی۔ بہاولپور اور نواکھالی کی طرح ہندو مسلمان نہیں بنے تھے۔ لیکن ایک دن۔

دن ڈھل چکا تھا تاجور سامری کھیتوں کی سیر سے گھر لوٹا تھا کہ گھنٹہ گھر کے چوک میں بنگالی مٹھائی والے کی دکان پر ایک بھیڑ نظر آئی وہ بھی اس میں مل گیا۔ ریڈیو سے کوئی بول رہا تھا! جانی پہچانی سی آواز محسوس ہوتی تھی۔

آواز کہہ رہی تھی!

"میں ہند کی تقسیم کو غیر قدرتی خیال کرتا رہا ہوں، ہماری جماعت نے اب تک اس عقیدے پر قائم رہکر انگریز اور اس کی مددگار طاقتوں سے جنگ لڑی، لیکن آج روتے ہوئے دل سے میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ اب وہ کڑوا گھونٹ ہمیں پینا ہی پڑے گا۔ فسادات کی آگ ہر گھڑی بڑھ رہی ہے۔ لوگ آپس میں کٹ رہے ہیں۔ آگ بستیوں اور خوبصورت شہروں کو جلائے جا رہی ہے۔ اب برداشت نہیں ہو سکتا۔ اب ہندوستان اور اسکے رہنے والوں کی بہتری اور آزادی کے لئے۔ میں اپنی جماعت کی طرف سے مونٹ بیٹن پلان کو منظور کرتا..... ہوں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حصہ جو ہند سے کٹ جائیگا اس کا مجھے دُکھ نہیں....."

آواز اب بھرا گئی تھی۔ محسوس ہوتا تھا جیسے بولنے والا۔ ایک کل کی طرح اپنا کام کر کے خاموش ہو گیا ہے۔ جیسے کہ فرض ایک بوجھ تھا جسے جلدی سے ٹپک کر سبکدوش ہونا چاہتا تھا۔ اس آواز میں ایک شکست ایک جھلاہٹ کی گونج تھی۔ اچانک تاجور سامری کی توجہ پھر ریڈیو نے کھینچی۔ یہ دہلی ہے۔ ابھی ہند کے وزیر اعظم پنڈت نہرو تقریر فرما رہے تھے۔ اب قائدِ اعظم

محمد علی جناح کے ارشادات سُنئے :۔

جناح کی تقریر آج خلافِ توقع اُردو میں تھی، وہ کہہ رہے تھے!

"میں مسلمانوں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کا خواب آج پورا ہوتا ہے۔ ان کی منزل پاکستان خود ہی انکے قدم چوم رہی ہے۔ مجھے خوشی ہے ہندوؤں کو آخر یہ سچائی ماننی پڑی کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ انکو دھوکے میں نہیں رکھا جا سکتا۔"

پاکستان زندہ باد۔ پاکستان پائندہ باد۔

جناح کی تقریر اگرچہ رٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی لیکن ان کے لہجے میں ایک غرور ایک فتحمندی کا احساس تھا۔ اس تقریر کا انداز کہہ رہا تھا۔ لہجے کا اجنبی پن الفاظ کی اکھڑی اکھڑی نشست ظاہر کر رہی تھی کہ ان باتوں کا کہنے والا اگر انگریز نہیں تو کم از کم ہندوستانی بھی نہیں، اس مختصر اگر پُراثر تقریر کے بعد ڈیفنس منسٹر سردار بلدیو سنگھ بھی بولے۔ لیکن ان کی تقریر میں سوائے انشاپردازی کی خوبیوں اور ایک وقتی قسم کی جذباتیت کے اور کچھ نہ تھا۔ البتہ ان کی تقریر کی ادائیگی کا انداز ضرور یہ کہتا تھا کوئی معشوق ہے اس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ریڈیو خاموش ہو چکا تھا اور سننے والوں دو واضح حصّوں میں بٹ گئے۔ ایک خوش کہ ناممکن بات ممکن ہو گئی۔ دوسرا غمگین کہ ایسا ہونیکی امید نہ تھی۔ لوگ خاموشی کے ساتھ اپنے گھروں کو جانے لگے۔ ہر بازار سے ریڈیو سُن کر آنیوالوں کے ٹولے تھے۔ لیکن خاموش۔ ایک امید و بیم کے عالم میں۔ لیکن اب یہاں بھی لوگوں میں ہندو اور مسلمان جاگنے لگے تھے۔ ایک مبہم سا خدشہ ہر ذہن کے کسی کونے میں راکھ سے دبی چنگاری کی طرح چمک اٹھا تھا۔ لیکن یہ ایک لہر تھی دھیرے دھیرے جو گزرتی گئی۔ امن اور معمولی کاروبار میں کوئی رخنہ نہ پڑا۔

راولپنڈی اور سرحد کے علاوہ نواکھالی کے مصیبت زدہ، جوق در جوق لائلپور میں

میں ہی کے رہنے والے ہیں۔ اُردو کے اچھے ادیب اور شاعر ہیں۔ جن کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جنھیں اچھے اچھے ادیبوں کی صحبت سے فیض پہنچا ہی۔ جنھیں لاہور کی ادبی فضا نے افسانہ نویس، ڈرامہ نگار اور شاعر بنایا، جنھوں نے ہندو گھر میں جنم لیا لیکن اپنے عمل سے ہندو مسلمانوں اور سکھوں کو یکساں سمجھا، جنھیں لاہور کے کتب خانوں، بازاروں رسائل کے دفتروں، ادیبوں، شاعروں، ہوٹلوں اور کافی ہاؤسوں میں کھوئے رہنے کا شوق اس وقت بھی تھا جب لاہور کے گلی کوچوں میں آگ لگی ہوئی تھی، جب انسانیت کی آواز اللہ اکبر اور ہر ہر مہادیو کے نعروں میں دب گئی تھی، اور جب انگریزی حکومت اپنے تقسیم کے رُجعت پسندانہ منصوبے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ میرا ہمیشہ یہ خیال رہا ہی کہ اچھا ادیب پہلے انسان ہوتا ہے اس کے بعد کچھ اور، اگر کسی ادیب کے ساتھ ایسا نہیں ہے تو اس کا ذہن مسموم ہے۔ چنانچہ جب میں حسن عسکری کے مضامین میں یہ دیکھتا ہوں کہ انھیں سارے مسلمان ادیبوں سے شکایت ہے کہ انھوں نے مسلمان قوم کے دو قوموں کے نظریہ کا ساتھ نہیں دیا تو مجھے ان کے اس رنج پر خوشی ہوتی ہی۔ ایسی ہی خوشی مجھے تاجور سامری کا یہ رپورتاژ پڑھ کر ہوئی ہی کیونکہ ان کا ذہن بھی مسموم نہیں ہی۔ بڑے سے بڑے طوفانوں اور حادثوں نے ان کی انسانیت دوستی کو متزلزل نہیں ہونے دیا حالانکہ کہیں نہ کہیں مایوسی نے ان پر ضرور حملہ کیا ہی۔

جب لائل پور کی صلح پسندانہ فضا بھی مسلمان فرقہ پرستوں، خود غرض کانگریسی رہنماؤں اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے فاشسٹ وطن دشمنوں نے خراب کر دی تو تاجور سامری کو بھی پناہ گزینوں کے قافلہ کے ساتھ ہندوستان آنا پڑا۔ یہ رپورتاژ درحقیقت اسی سفر کی کہانی ہی۔ جب میں نے امریکی ناول نگار اسٹائن بک کا ناول "گریپس آف راتھ"

داخل ہوتے رہے تھے۔ سراؤں دھرمشالوں کے کمرے اور دالان برآمدے۔ جہاں تک کہ صحن، عورتوں بچوں اور مردوں سے پٹنے لگے۔ کاروباری لوگ مکان اور دکان کے لئے الگ شہر میں جدوجہد کرنے لگے۔ مصیبت زدوں کی مددگار سبھا کے رکنوں نے ان کی خوب خوب مدد کی، جو مکان کے مالک تھے انہوں نے ایک روپیہ کرایہ کی کوٹھڑی کا پچیس روپیہ کردیا جو مکان کے مالک نہ تھے انہوں نے دلالی کا پیشہ اختیار کرلیا۔ ہر طرف خوب گہما گہمی کا عالم نظر آنے لگا۔ بازار جب پکی دکانوں اور کھوکھوں میں نہ سما سکا تو پٹریوں اور بازاروں، گلیوں کے کونوں پر پھیل گیا۔ مندروں اور گوردواروں کے اجارہ دار ایسے میں بھلا کہاں پیچھے رہنے والے تھے۔ مندر کے پجاری، اور گوردوارے کے گرنتھی صاحبان کی ہمدردی کی رگ بھی پھڑکی انہوں نے مصیبت زدوں کی جوان خوبصورت لڑکیوں کو ٹھکانے لگانے کے کام میں تیزی دکھاتے ہوئے انکی مدد کی۔

اِدھر یہ عالم تھا اور اُدھر وہ لوگ جو ذرا سمجھدار تھے۔ تقسیم ہند کے خطرناک نتیجے سے خوفزدہ ہوکر اپنی جائدادیں بیچ رہے تھے۔ اپنا روپیہ اور زیور دہلی اور بمبئی کے بنکوں میں بھجوا رہے تھے۔

لائلپور میں پورا امن تھا۔ لیکن آس پاس سے فساد اور آگ اور خون کی وارداتوں کی گونج زور شور سے سنائی دینے لگی تھی ایک دن بڑے گوردوارے میں؟

راشٹریہ سوئم سیوک اور اکالی رجمنٹ کے بانکے جمع ہوئے اور طے پایا کہ شہر سے مسلمان کو ڈرا دھمکا کر بھگا دیا جائے۔ اور ان کے مکانوں میں باہر سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کو بسا کر شہر کو خالص ہندو سکھ آبادی کا بنا دیا جائے! تاکہ تقسیم کے وقت لائلپور تو کم از کم ہندوستان میں آجائے۔

ایک خالصہ جی نے فخریہ انداز میں کہا۔ لالہ جی آپ سے خالی تجوریں ہی بن سکیں گی۔ عملی

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

صورت بھی کوئی تباؤنا۔

ایک سوئم سیوک جوش کو دباتے ہوئے بولا عمل کے لئے ہم آپ سے پیچھے نہ رہیں گے۔ سردار جی! لیکن آپ ہی مدد کریں!

خالصہ جی! اگر مدد کے بھروسہ پر ہی کام کرنا ہو تو کامیابی سو فیصدی سمجھو! ذرا دیکھنا موقع ملنے پر اکیلا خالصہ مسلمانوں کو لنڈی کوتل سے پرے پہنچاتا ہو کہ نہیں!

ایک بزرگ سکھ بولے۔ خاموش! آج کل دیوار بھی کان رکھتی ہو۔ جو بات کرنی ہو آہستہ کرو۔ شور اور جوش کام بگاڑ دیتا ہو۔

اس پر سب خاموش ہوگئے۔ اور طے پایا کہ جمعہ کے دن جامع مسجد میں ایک بم رکھ دیا جائے اس کے بعد مسلمان خود بخود شہر چھوڑ دیں گے؟ یہ تجویز سب کو پسند آئی اور کام کرنیوالوں کے نام سنگھ نائک نے اپنے پاس محفوظ رکھ کر کہا۔ ان سیوکوں کو گھر پر اطلاع ملجائے گی۔ یہاں ان کا نام ظاہر کرنیکی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد یہ جلسہ برخاست ہوا۔

کچہری بازار کے پچھواڑے جامع مسجد میں جمعہ کے دن اچانک ایک دھماکا ہوا۔ ایک بوڑھا نمازی زخمی ہوگیا۔ مولوی صاحب منبر پر بیٹھے ہندوؤں اور سکھوں کی کمینگی اور بزدلی پر تقریر کر رہے تھے۔ اس دھماکے سے بدحواس ہو کر منبر سے گر پڑے۔ سارے حاضرین میں بھگدڑ مچ گئی اور بازاروں میں لوگ خوفزدہ ہو کر بھاگنے لگے۔ دھماکے کی آواز دُور دُور تک سنائی دی تھی۔ یہ گڑبڑ اور بھاگڑ دیکھ بازار بند ہونے لگے۔ بازاروں سے لوگ گھروں کو بھاگنے لگے۔ اچانک ایک گھبرایا ہوا دیہاتی مسلمان گوردوارے کی گلی میں آگیا۔ مشتعل ہندو سکھ ہجوم نے اسے گھیر لیا۔ وہ بچارا ان کے پاؤں پر گر پڑا کہ مجھے معاف کردو، میں

غشی سے ابھر آگیا ہوں۔ ایک خالصہ جی بولے۔ اب یہ جھوٹ نہیں چلے گا۔ سالہ جاسوس بن کر آیا ہے۔

ایک سوئم سیوک وہیں کھڑا تھا بولا اسکو پکڑ لو جی۔ ایک خالصہ نے کرپان کھینچ کر اس مسلمان کی گردن اڑاتے ہوئے کہا۔ ختم کر دو جی!

سارے شہر میں فساد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ڈپٹی کمشنر نکل سین صاحب نے سارے شہر اور میونسپل علاقوں میں ۲۴ گھنٹے کا کرفیو لگا دیا ——— پبلسٹی لاری سڑکوں بازاروں اور دور دراز محلوں میں یہ اعلان کرتی پھر رہی تھی ——— تھوڑی ہی دیر میں شہر میں افراتفری اور اشتعال کی آگ سرد ہو گئی۔ اور لوگ جہاں تھے وہیں بند ہو کر رہ گئے۔ سنسان بازاروں اور گھنٹہ گھر کے چوک میں صرف پولیس اور سیوک گارڈ کے جوان، رائفلیں لئے پھر رہے تھے۔

اس دوران میں مسلمانوں نے صرف ایک بار جرأت سے کام لیا اور ایک اندھیری رات کو سکھوں کے اس محلے پر آ پڑے جہاں وہ مسلمان دیہاتی قتل ہوا تھا۔ لیکن ادھر بھی لوگ کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ دشمن کے ارادے کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی۔ چنانچہ ہندو سکھ متحدہ طور پر تیار تھے۔ حملہ آوروں سے خوب مقابلہ کیا مخالف بھی جان توڑ کر لڑے لیکن آخر بھاگنا پڑا۔

اس کے بعد مسلمانوں پر عام طور سے دہشت چھا گئی اور ہندو محلوں کے قریب رہنے والے راتوں رات شہر چھوڑ گئے۔ یا خالص مسلمان آبادی میں جا گھسے۔ اب سکھوں نے باقاعدہ پراپیگنڈا شروع کر دیا کہ لائل پور کو ضرور ہندوستان میں آئے گا۔ کوئی کہتا، اجی بس لائلپور تو آیا آیا ہی سمجھئے ہندوستان میں!

دوسرے نے پوچھا۔ کوئی دلیل!

جواب ملتا۔ لائلپور جڑانوالہ سے ملتا ہے۔ اور جڑانوالہ ننکانہ صاحب کے قریب، اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ سکھ جان دیدینگے۔ لیکن پرتھم بادشاہی کی جم بھومی نہیں دینگے! اگر ننکانہ صاحب ہمارے پاس رہا تو لائلپور تو سو فیصدی رہے گا۔

دوسرے خالصہ جی کہتے۔ لاہور تو مہاراج رنجیت سنگھ کی راجدھانی تھی! اس کارن ہم سے چھین نہیں سکتا۔ راولپنڈی پنجہ صاحب کی وجہ سے ہمارے پاس رہیگی۔

کوئی سنگھی ہندو، فوراً بول اٹھتے، کٹاس راج۔ تکشلا۔ ہندو نہیں چھوڑیں گے

پہلا خالصہ جوش سے کہتا۔ بس پھر کیا ہے۔ یہ تُرکے تو پھر کہیں بھی نہیں رہ سکتے۔ ایک مرتبہ جو ملکر ہلّا کیا ہم نے تو مسلمانوں کو کابل سے آگے بھی پناہ نہیں ملے گی۔

اس پر پاس کھڑے سننے والے خوشی سے قہقہے مارنے لگتے اور باتیں کرنیوالے منتشر ہو جاتے۔

سکھوں نے حد بندی کمیشن کے اعلان سے پہلے ننکانہ صاحب میں ایک خاص جلسہ بلایا دم توڑتی انگریز حکومت نے اس خیال سے کہ کہیں یہ سورما لوگ ان کی سازش کو ناکام نہ کر دیں۔ اس اکٹھ پر پابندی لگادی اور ننکانہ صاحب جانے والے ہر رستے پر فوج کا پہرا بٹھا دیا۔ لیکن اس طرح یہ طوفان کہاں رُکتا؟ پہنچنے والے راہ راستے چھوڑ کھیتوں اور نہروں کو چیرتے ہوئے ننکانہ صاحب پہنچ گئے۔ لائلپور کے اکالی وکیل دلیپ سنگھ کنگ گرنتھی کے بھیس میں اور کانفرنس کے پردھان گیانی کرتار سنگھ ایک عام دہقان کے بھیس میں چارے کا گٹھا اٹھائے وہاں جا پہنچے۔ کہتے ہیں وہاں سب نے اپنی اپنی ہانکی، اور آخر کوٹ پایا کہ چاہے حد بندی کا کمیشن کچھ بھی فیصلہ کرے سکھ پنجاب میں ڈٹے رہیں گے۔

لائلپور۔ یہی اس کانفرنس کے اس پرجوش اعلان کا اچھا اثر ہوا۔ بھگوڑوں نے اپنی رفتار ذرا دھیمی کردی۔ عوام میں ایک اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور ہندوؤں میں اب اس بات کا پرچار ہونے لگا کہ جان جائے پر آن نہ جائے کے قول کو سچا کر دکھائیں گے۔ لائلپور کو چھوڑنے والا غدار! کانگریس کے لیڈر الگ ہانک پکار مچا رہے تھے کہ چاہے پاکستان بن جائے لیکن سب لوگوں کو اپنے اپنے ٹھور ٹھکانوں پر ڈٹے رہنا چاہیئے۔ ادھر دیہات میں سکھ جاٹ اسلحہ جمع کر رہے تھے۔ دیسی ساخت کی توپوں اور گھر کے تیار شدہ گولے بارود کی باقاعدہ مشق کرنے لگ گئے تھے۔ اب راتیں اکثر دھماکوں اور پٹاخوں سے آباد ہوتی تھیں۔ ہندو لائسنسداروں نے اب پورے زور شور سے اپنی قوم کی مدد پر کمر باندھ لی تھی۔ گندھک، پوٹاس، اور دوسرے آتشیں مادے چور بازار میں کھلم کھلا مہنگے داموں بک رہے تھے۔ لالہ بھگت رام چانن اور سکھ دیال لوہیے چار آنے فٹ کی جستی اور آہنی نال دس روپے فٹ توپوں کی تیاری کیلئے نہایت فراخدلی سے دیہاتی لوہاروں کو سپلائی کر رہے تھے۔

کارخانہ بازار میں دوآبہ ہاؤس والوں کی دکان اب بحثوں اور مشوروں کا اڈا بن گئی تھی۔ مان پور، گنگا سنگھ والا، چوہڑ جاجرا اور نور پور کے جاٹ اور نام دھاری سنگھ وہاں اکثر پراسرار طور پر بیٹھے آنکھیں اور ہاتھ گھما گھما کر سرگوشیاں کرتے نظر آئے۔ تاجور سامری بھی اکثر وہاں بیٹھا رہتا۔ دوآبہ ہاؤس کے مالک کپور صاحب، جوش اور راز کے انداز میں کہتے تاجور صاحب! اب آپ کا کیا خیال ہے۔ لائلپور پاکستان میں آئیگا۔

وہ جواب دیتا۔ سو فیصدی

اور یہ تیاریاں؟

بے معنی! کیونکہ یہ اس وقت ضرور اچھی لگیں گی، جب تک اس کے متعلق ٹھیک فیصلہ

نہیں ہوجاتا، اس کے بعد تو فوجیں آپ کو یہاں سے نکالیں گی، ان کی گولیاں اور شرنارتھیوں کے برچھے آپ کو گھر بار چھوڑنے پر مجبور کریں گے!

ایک اکالی بول اٹھے، یہ کیونکر ہوسکتا ہے، وہاں تو سب کچھ طے ہوچکا۔

تاجور سامری طنزیہ حیرت سے کہتا۔ اچھا! یہ کب!

اجی! اسی کانفرنس میں یہ طے ہوا، لائلپور اور ننکانہ صاحب ہندوستان میں رہیں گے یا ان کی الگ ایک آزاد ریاست بنا دی جائے۔

کپور صاحب۔ تاجور سامری کی طرف دیکھ کر مسکراتے۔ اور پھر کہنے لگتے، لیکن خالصہ جی یہ فیصلہ تو سرسرل ریڈکلف کے ہاتھ میں ہے۔

اوہو! آپ تو بھولے آدمی ہیں۔ بھائی صاحب! وہ بھی اس کانفرنس میں موجود تھے ماسٹر جی بھی وہیں تھے انہوں نے لال آنکھیں نکالکر کہا اگر سکھوں کو ناراض کردیا تو اچھی بات نہ ہوگی۔

ریڈکلف صاحب نے کانپ کر ہاتھ باندھ کر کہا۔ آپ گھبراتے کیوں ہیں ماسٹر جی! میں نے یہ نقطہ پہلے ہی سمجھ لیا ہے۔ ننکانہ صاحب کے ساتھ لائلپور بھی ہندوستان میں آئیگا اب تو خوش ہیں آپ ——— تب کہیں جاکر ماسٹر جی خاموش ہوئے!

تاجور سامری نے پھر طنز کا ایک زہریلا تیر چھوڑتے ہوئے بھولے پن سے کہا، ہاں اب مجھے بھی یاد آگیا۔ ایسا ضرور ہوا تھا۔ ہندو سبھا کے پردھان ویر ساورکر اور سوامی سیوک سنگھ کے گورو گولوالکر بھی تو وہیں تھے!

خالصہ جی خوشی کے جوش میں پکارے، ہاں ہاں کیوں نہ ہونگے۔ ان کو بھی تو بلایا تھا ماسٹر جی نے!

کپور صاحب نے پھر پراسرار سنجیدگی سے کہا میں نے تو پرسوں اخبار میں پڑھی تھی یہ خبر۔ سنگھ کے گورو نے دھمکی بھی دی تھی کہ اگر ریڈ کلف صاحب نے من مانی کی! تو میں سارے سنگھ کو حکم دیدونگا کہ وہ انگلینڈ پر چڑھائی کردے۔

تاجور سامری نے ہنسی کو مشکل سے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ پھر تو ریڈ کلف صاحب خوب گھبرائے ہونگے؟ خالصہ جی! اب کچھ سمجھ گئے تھے لیکن بے اختیار ہنسے کیوں نہیں، گھبرانے کی تو بات ہی تھی اور کھسیا کر دکان سے نکل گئے۔ اور یہاں سارے قہقہوں اور کھانسی کی دھانسوں میں گھر گئے۔

چند ایسے ضلعوں میں سرحدی فوج بٹھا دی گئی جن کے متعلق فیصلہ بعد میں ہونا تھا۔ اور لطف کی بات یہ تھی کہ مسلمان اکثریت کے علاقوں میں ہندو سکھ فوجیں اور ہندو اکثریت کے ضلعوں میں مسلمان بلوچی پلٹنیں تعینات کی گئیں۔ اس میں راز یہ تھا کہ فساد کی آگ جو ان علاقوں کے رہنے والوں کے آپس کے بجھوتے سے سرد پڑ گئی تھی بھڑکا دی جائے۔ چنانچہ مشرقی پنجاب عام طور پر ہندو سکھ اور مغربی پنجاب میں بلوچی سپاہی بڑی سرعت اور وفاداری سے اپنے اپنے لیڈروں کی سکیموں پر عمل کرنے لگے۔ مشرقی پنجاب میں ریاستی فوجوں اور خاص طور پر پٹیالہ اور کپورتھلہ کی فوجوں نے زیادہ نمایاں کارنامے دکھائے۔ مسلمانوں کو ہجوموں اور گروہوں کی صورت میں گولیوں اور مشین گنوں کا نشانہ بنایا گیا۔ جو بھاگ سکے وہ ایک زہریلا جذبہ لئے مغربی پنجاب میں آئے۔ ستائے گئے لوگ قدرتی طور پر انتقامی جذبے سے مغلوب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان مسلمان پناہ گزینوں کے آنے سے ادھر کے مسلمان عوام اور فوجی بھڑک اٹھے اور ہندو عوام کے لئے اب رہنا بسنا ناممکن ہوگیا۔ شیخوپورہ۔ لاہور۔ اور لائلپور کے آس پاس فساد اور قتل کی خبریں شدت سے آنے لگیں ——— تاجور سامری کے زور دینے پر

اس کی ماں کچھ سامان امرت سر کے ایک گاؤں میں اپنی لڑکی کے پاس چھوڑ آئی۔ لیکن اس کے بعد کے حالات خرابی اور خوفناکی کی طرف زیادہ جھکنے لگے اب شہر سے قدم باہر نکالنا موت کو دعوت دینا تھا۔ ہندو ڈپٹی کمشنر مسٹر نکلسن کی جگہ کئی دنوں سے آغا عبدالحمید خاں سنبھال چکے تھے۔ ان کی انتظامی قابلیت اور خلوص کے کارن ابھی شہر میں امن کا راج تھا۔ لیکن ہراس اور بداعتمادی لوگوں میں بڑھتی جارہی تھی۔ شہر پر ایک خوفناک سایہ دھیرے دھیرے بڑھا چلا آرہا تھا۔ مشرقی پنجاب کے مصیبت زدہ مسلمان ادھر آتو رہے تھے لیکن ڈپٹی کمشنر انہیں شہر میں آنے سے ابھی تک روک رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یقیناً یہی تھا کہ دیہات کے سکھ کسانوں پر اثر پڑے۔ چنانچہ اب یہ خوفناک خبریں روز سننے میں آتیں کہ فلاں گاؤں میں پناہ گزینوں نے تباہی مچادی۔ فلاں گاؤں کے سکھ زمیندار قافلہ کی صورت میں ہندوستان کو چل پڑے۔ گاؤں اجڑ اجڑا کر بس رہے تھے لیکن ابھی پناہ گزینوں کی آمد جاری تھی۔ اور اب وہ شہر کے باہر ڈیرے ڈال رہے تھے۔ درختوں کے نیچے خالی اور ٹوٹی پھوٹی عمارتوں میں ریلوے پلیٹ فارم پر اور نہروں کے کنارے، ہر جگہ مسلمان پناہ گزیں نظر آتے تھے۔ شہر کے لوگ ڈر رہے تھے اور باہر کی بستیوں کو چھوڑ کر مرکز کے محلوں میں جمع ہو رہے تھے۔ ڈپٹی کا حکم بار بار پبلسٹی موٹر کے ذریعہ گونجتا کہ ہندو سکھ اپنی جگہ پر ڈٹے رہیں۔ ان کی حفاظت کی جائے گی۔ ان کو اپنے گھروں میں ہی رہنا چاہیئے۔ لیکن کون سنتا تھا۔ لوگ گھروں اور محلوں کو چھوڑنے لگے۔ اور بیرون شہر کے مسلمان مصیبت زدہ ان مکانوں پر قبضہ کرنے لگے۔ اب حاکم شہر بھی مجبور تھا کیا کرتا۔ اب شہر میں بھی اکا دکا قتل اور لوٹ کھسوٹ کی خبریں سننے میں آرہی تھیں اور شہر کے پونجی پتی اور کاروباری لوگ پھر کھسکنے شروع ہوئے۔ ہندو لیڈر کانگریس کے نیتا۔ اور سکھ رہنما ایک طرف تو لوگوں میں بھروسا پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کو شہر نہ چھوڑنے کی تلقین

کرتے لیکن خود چپکے چپکے اپنا قیمتی سامان روپیہ پیسہ اور عورتیں بچے، ہوائی جہازوں سے دہلی بھیج رہے تھے۔ ریڈیو پر روز اعلان ہوتا آج فلاں صاحب کی طرف سے فلاں خاندان کے لئے۔ فلاں نمبر کا ہوائی جہاز آرہا ہے۔ کبھی پتا چلتا آج فلاں لالہ جی اپنی بیوی بچوں کے ساتھ دہلی کو اڑ گئے، لوگوں میں ہراس بڑھ رہا تھا۔ فسادی کی آگ کے شعلے لائلپور کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ چینوٹ جل چکا تھا اس کے دولت مند مہاجن اور ساہوکار اب لٹ لٹا کر لائلپور کی دھرم شالاؤں اور مسافر خانوں میں دبکے بیٹھے تھے، لائلپور والوں کی مدد اور مسلمان ڈپٹی کمشنر کی ہمدردی ان کے آنسو خشک نہ کرسکی، اگرچہ وہ جان توڑ کر لڑے تھے لیکن فوجی بلوچیوں سے وہ کب تک لڑتے آخر انہیں ہتھیار ڈال کر خود کو بھڑکے ہوئے حملہ آوروں کے حوالہ کرنا پڑا۔ اپنا آرام، عزت روپیہ جوان لڑکیاں بطور جرمانہ دینی پڑیں۔ اور اس کے بعد وہ لائل پور میں آئے تھے کہ یہاں گوسوامی گنیش دت سے اپنا دکھڑا روئیں گے۔ پنڈت نہرو کو تار دیں گے۔ پردھان ویر ساورکر سے فریاد کرینگے۔ لیکن ہوا کیا؟ ناامیدی، پنڈت نہرو اب ان کے لئے غیر ہو چکے تھے ویر ساورکر بے بس اور گوسوامی گنیش دت لائلپور والوں کو بھی چکمہ دیکر اور چندہ اینٹھ کر انہیں مصیبت میں چھوڑ کر دہلی جمپت ہو چکے تھے، یہاں کے ہندو پہلے ہی ان کی جان کو رو رہے تھے۔ اور کانگریسی لیڈر، وہ بگلے جیسے سفید کھدر کے لباس میں نیکی اور ایمانداری کے فرشتہ بنے لوگوں میں ابھی بھروسا پیدا کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ ہم تمہیں چھوڑ کر ہرگز نہیں جائینگے اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم ابھی تک نہیں گئے۔ لیکن کیا وہ سچ کہتے تھے۔ کیا واقعی ان کو لائلپور کے عوام سے ہمدردی تھی۔ اور انہوں نے شہر چھوڑنا اس لئے گوارا نہیں کیا تھا کہ لوگوں کی حفاظت ان کے ذمے تھی؟ نہیں! یہ بات نہیں دراصل ابھی ان کے لئے ہوائی جہازوں کا انتظام نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی ان کو ٹرکوں کے پرمٹ نہیں ملے تھے۔

پڑھا تھا تو اُس کا اثر میرے دل و دماغ پر بہت گہرا تھا، پھر لکھنؤ میں بیٹھ کر جب میں نے اخباروں میں تبادلۂ آبادی کی داستانیں پڑھیں، میلوں لمبے پیدل چلنے والے قافلوں کا حال سنا تو میرے دل نے کہا کہ ان خونین اور ہیبتناک واقعات پر "گریپس آف رائتھ" سے بڑا ناول لکھا جا سکتا ہے۔ وہاں وہ جذباتی پس منظر بھی مفقود تھا اور واقعہ کی عظمت بھی جو ہندوستان میں رُونما ہوا لیکن شاید ابھی ویسا ناول کچھ دنوں کے بعد لکھا جا سکے گا اور اس ناول میں "جب بندھن ٹوٹے" سے بڑی مدد ملے گی۔ تاجور سامری نے بڑی تخلیقی صلاحیت سے یہ رپورتاژ لکھا ہے۔ کیونکہ واقعات سے اس قدر قریب ہو کر اہم اور غیر اہم کی تمیز مشکل ہو جاتی ہے۔ فوری جذبات کے مقابلہ میں اپنے نقطۂ نظر کے توازن کو برقرار رکھنا دشوار ہو جاتا ہے لیکن انھوں نے بڑی کامیابی سے اپنے موضوع کو رپورتاژ کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اس موضوع میں جذباتیت کی بڑی گنجائش ہے لیکن تاجور سامری نے مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔ اور اس صداقت کو برقرار رکھا ہے جو رپورتاژ کے لئے ضروری تھی۔ اس صداقت کے اظہار میں انھوں نے جس فراخدلی اور انصاف پسندی سے کام لیا ہے وہ بھی پڑھنے والے کو بہت متاثر کرے گی۔

تاجور سامری نے اس رپورتاژ میں جو اہم مسئلے اُٹھائے ہیں ان پر اس کتاب سے الگ ہو کر بھی غور کیا جائیگا۔ تبادلۂ آبادی اور شرنارتھیوں کا مسئلہ ہندوستان اور پاکستان کے لئے محض ایک اقتصادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ تہذیبی مسئلہ بھی ہے۔ کیا وہ مسلمان جو ہندوستان کے مختلف حصّوں سے پاکستان گئے ہیں وہاں کی زندگی میں صرف اس لئے کھپ جائیں گے کہ ان کا مذہب اسلام ہے؟ کیا وہ سارے ہندو اور سکھ جو پاکستان سے ہندوستان آئے ہیں یہاں وہی سکون پائیں گے جو انہیں اپنے گھروں میں حاصل تھا؟

ایک شام کو ہنومان کے مندر کے کوٹھے پر شہر والوں نے سبھا جمائی ، شہر کے لیڈر، سیٹھ اور محافظ بھی اس میں موجود تھے ، تاجور سامری بھی گیا۔ لالہ بھگت رام چاننہ نے اٹھ کر کہا۔ مجھے پتا چلا ہے کہ لوگ شہر چھوڑ رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ بیوقوفی اور بزدلی کی بات ہے۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ ہماری تاریخ ایسا نہیں کہتی۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب کو بہادری اور حوصلے سے اپنے شہر میں ڈٹے رہنا چاہیئے۔

سیٹھ بنواری لال اپنی توند کا سہارا لے کر اُٹھے اور بولے۔ سجنو! میری طرف دیکھو میں ابھی تک آپ کے سہارے دلجمعی سے بیٹھا ہوں اور ٹھان چکا ہوں کہ مر جاؤں گا۔ مگر وطن نہیں چھوڑوں گا۔ اگر گیا تو سب کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ پیارے دیس واسیو! اگر جانا ہے تو سارے شہر کو جانا ہے۔ مرنا ہے تو سارے شہر کو مرنا ہے۔ اس پر خوب تالیاں پٹیں، لالہ سندرو اس جیل کے ٹھیکیدار صاحب گھبرا کر بولے۔ ارے رے یہ کیا کرتے ہو۔ سامنے ہی جامع مسجد ہے مسلمانوں کو ہماری اس سبھا کا پتہ چل گیا۔ تو سب گیا دھرا چوپٹ ہو جائیگا

سنگھ کے ایک سرکردہ رکن پرکاش لال جی اٹھے! اور دھیمے دھیمے لہجے میں دیوبانی ہندی میں کہنے لگے۔

"سجنو! آپ کے سنمکھ شری سیٹھ جی اور لالہ بھگت رام چاننہ جی نے جو یہ پرستاو رکھا ہے۔ سراہنیہ ہے، میں اس کا سمرتھن کرتا ہوں۔ آشا ہے آپ سب اپنے کرتویہ کا پالن کرینگے۔ میں آپ کے سنمکھ یہ پرتگیہ لیتا ہوں کہ جیتے جی شہر نہ چھوڑوں گا۔"

اس پر سارے حاضرین خوش ہو گئے تاجور سامری کے والد پنڈت کرپا رام لاغر بھی ایک جذبے کے ساتھ اٹھے اور ایک پرجوش پنجابی نظم جھاڑ دی ، اور واہ واہ کے شور

کے ساتھ محفل برخاست ہوئی۔

تاریخ کا ایک حیرت ناک حادثہ ہوگیا۔ انگریز امرکین سازش نے ایک عظیم ملک کے دو ملک بنا دیئے۔ ایک نسل ایک خون کو دو دشمن ملکوں، دو الگ الگ قوموں میں بانٹ دیا، آزادی کا دن خوشی کے نعروں فتح کے گیتوں آہوں بھڑکتے ہوئے شعلوں اور خون کی لہروں کے درمیان بیت گیا، سامراج نے ہندوستان کے بازوئے شمشیر زن کو کاٹ کے رکھ دیا۔ ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی۔ آج زندہ دل پنجاب کی لاش پر گدھ ناچ رہے تھے، چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ لاہور میں بدستور آگ بھڑک رہی تھی۔ فلک بوس عمارتیں گر رہی تھیں۔ لوگ چھروں بموں اور فوج اور پولیس کی گولیوں کا شکار ہو رہے تھے شیخوپورہ، سرحد، فساد کے سیلاب میں بہ گئے تھے۔ مشرقی پنجاب کے مختلف ضلعوں میں موت ناچتی اور دھم مچاتی پھر رہی تھی۔ تہذیب اخلاق اور انسانیت کی ننگی لاشوں کو وقت کے کتے بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر کھا رہے تھے۔ ادھر کراچی میں شاہِ پاکستان کا جشن تاجپوشی منایا جا رہا تھا۔ قائداعظم زندہ باد، پاکستان زندہ باد کے نعروں سے اس عجیب قسم کی آزادی کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ دہلی میں پنڈت نہرو لال قلعے پر ترنگا جھنڈا لہراتے ہوئے آزادی کی خوشیاں منا رہے تھے۔ سارا دن اور آدھی رات دونوں ملکوں کے ریڈیو چیخ چیخ کر آزادی کے گیت گا رہے تھے۔ غداروں اور قاتلوں کو فاتح اور خادم ملک کے خطابوں سے نوازا جا رہا تھا دونوں ملکوں کی راجدھانی میں روشنی اور مسرت تھی۔ لیکن اس تھوڑی ہی دور دونوں ملکوں میں موت کا خوفناک ناچ تیزی سے جاری تھا۔

سرحدی فوج ہندوستان اور پاکستان کے قیام کے بعد توڑ دی گئی اور فوج کے انگریز کمانڈر جنرل ریز کی مستعدی اور چالاکی کی سب داد دے رہے تھے۔ ہندوستان والے خوش تھے اگر جنرل ریز نہ ہوتے تو مشرقی پنجاب پاکستان میں چلا جاتا اور پاکستان والے دلشاد

کہ اگر جنرل ریز کی حکمت عملی نہ ہوتی تو راولپنڈی تک ہندوستان چھا جاتا، اور بہ ظاہر دونوں جنرل ریز کو رگید رہے تھے۔

اب دونوں ملکوں کی اپنی اپنی فوجیں تھیں اور سرحدی کمیشن کے فیصلے کے بعد لائلپور پاکستانی ہو چکا تھا۔ مسلمان فوجیں پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتی لائلپور میں آنے لگیں، اور لائلپور والے ہندو سکھ جو کچھ اور ہی خواب دیکھ رہے تھے بھنا کر رہ گئے۔ سب بجھے ہوئے تھے۔ دلوں کے ساتھ مکانوں اور بازاروں سے بھی رونق اور روشنی غائب ہو گئی۔ آج سے چند دن پہلے جو مکانوں کی قیمت سکھوں کے پراپیگنڈے کے کارن چڑھ گئی تھی۔ اب صفر ہو کر رہ گئی۔ لوگ بھر بھاگنے لگے۔ مشرقی پنجاب سے پٹے ہوئے مسلمان پناہ گزیں اب زیادہ تعداد میں شہر کے گرد منڈلانے لگے۔ اور شہر والوں کا چلنا پھرنا ناممکن ہو گیا۔ شہر سے باہر جو کوئی جاتا گھر نہ لوٹتا۔ ریل تار ڈاک اور عام بس سروسیں رک گئیں، لوگ مایوسی کے اندھیرے میں بھٹکنے لگے۔ روپے والے مہنگے داموں ٹرک کرائے پر لیکر شہر چھوڑنے لگے۔ اور اکثر وہ ٹرک طارق آباد سے آگے نہ گزرنے پاتے، ڈپٹی کمشنر ابھی تک شہر میں امن اور بھروسا پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف تھے، لیکن کیونکر، ہندو افسر، سپاہی، کارندے سبھی ہندوستان جا چکے تھے یا جا رہے تھے۔ شہر کے بڑے بڑے کاروباری لوگ ہندوستان جا چکے تھے۔ مشہور دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ لوگوں کا اعتماد کیونکر بحال ہو سکتا تھا۔ لیکن حاکم شہر نے ایک کوشش پھر کی۔ اور ایک صبح سب شہریوں کو گھنٹہ گھر کے چوک میں مدعو کیا! اس مجمع میں ہندو سکھ مسلمان سبھی تھے، گھنٹہ گھر کے چبوترے پر بلوچی سپاہی رائفلیں لئے کھڑے تھے اور گھنٹہ گھر کی دوسری منزل پر لاؤڈ سپیکر لگے ہوئے تھے۔ سب منہ اٹھائے ادھر دیکھتے جاتے تھے۔

لاؤڈ سپیکر پکار اٹھا، دوستو!، صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر نے آپ کو اس لئے بلایا ہی کہ وہ اپنے خیالات اور نئے حالات کے مطابق کچھ ہدایتیں دیسکیں۔ لیجیے صاحب بہادر خود ارشاد فرماتے ہیں!

اس کے بعد ایک دھیمی مگر پر وقار آواز گونجی ۔ میرے رفیقو! مجھے اس بات کا افسوس کے ساتھ اعتراف ہی کہ جب سے آپکی خدمت کا ذمہ میں نے لیا ہی۔ حالات بُرے سے بُرے ہوتے گئے۔ لیکن اب میں نے فیصلہ کر لیا ہی کہ ان خرابیوں کے خلاف پوری طاقت سے لڑوں گا۔ پاکستان بن جانے کے بعد میری ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں کا رہنے والا ہر شخص اپنے کو آزاد سمجھے۔ جو شخص قانون اور اخلاق کی حمایت کریگا میں اس کی حفاظت کرونگا۔ میری نظر میں ہندو مسلمان سکھ صرف پاکستانی ہیں میں ان سب کو بطور پاکستانی ......

ابھی یہ فقرہ مکمل بھی نہ ہوا تھا! ...... کہ مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ بعض سکھ جوان اپنی کرپانیں پھینک کر صرف نیام تھامے بھاگ رہے تھے، واقعہ یہ تھا کوٹھے پر بیٹھے لوگوں سے منڈیروں کے کنگرے دکانوں کی ٹینوں پر گرے اور لوگوں نے سمجھا گولی چل گئی۔

لاؤڈ سپیکر پکار رہا تھا لوگو ٹھیرو۔ بھاگو مت کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ جہاں ہو وہیں رک جاؤ۔ صاحب بہادر نیچے تشریف لا رہے ہیں۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے بھاگنے والوں میں سستی آگئی تھی، لوگ تھمنے لگے۔ اس ہلچل کے درمیان ایک سکھ جوان خون میں لت پت تڑپ رہا تھا۔ پولیس والے اسے اٹھا کر گھنٹہ گھر کے چبوترے پر لائے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب اس دوران میں گھنٹہ گھر سے نیچے آ کر حیرت افسوس اور غصّے کے ملے جلے انداز میں

کھڑے تھے۔ لاش کو دیکھ کر وہ بھڑک اٹھے اور چلا کر بولے۔ بھاگو مت لوگو! میں قاتل کو معاف نہیں کروں گا۔ سپاہیو! اسکو۔ پکڑواسے۔ وہ چنیوٹ بازار میں مسجد گلی میں گھسا ہے۔ اسپر بلوچ صوبیدار نے کہا، حالات خطرناک ہیں گولی چلادوں؟ ڈپٹی کمشنر صاحب گرجکر بولے؟ کیوں! حاکم وقت میں ہوں! جس کا قصور ہے اسکو بھی جانتا ہوں۔ بے قصور لوگوں کو خواہ مخواہ مروادوں!

صوبیدار بولا۔ مگر صاحب یہ ہندو سکھ،

ڈپٹی کمشنر صاحب آپے سے باہر ہو کر بولے۔ خاموش، میں یہ لاقانونی برداشت نہیں کر سکتا۔ سیلبٹی آفیسر سے کہہ دو کہ وہ ابھی سے بیالیس گھنٹہ کے لئے کرفیو کے نفاذ کا اعلان کرادے۔ ذرادیر رک کر بولے "وہ قاتل پکڑا گیا ہے؛ جواب خاموشی تھا۔

وہ پھر جھلا کر بولے۔ میں یہ برداشت نہیں کرونگا۔ میں قاتل کو پہچانتا ہوں۔ میں خود اسے پکڑونگا۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے چنیوٹ بازار کی طرف لپکے۔ ان کے پیچھے سپرنٹنڈنٹ پولس آغا نجیب اللہ خاں ملک غلام حیدر سٹی انسپکٹر اور پولیس کے سپاہی ...... لوگ چپ چاپ اپنے گھروں کو چلے گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد سیلبٹی کی موٹر سنسان بازار میں چیختی ہوئی پھر رہی تھی۔ کرفیو بیالیس گھنٹہ رہے گا، بلوچی فوجی رائفلوں پر سنگین چڑھائے آنکھیں انتقام اور تعصب کی آگ سے سرخ کئے بھوکے کتوں کی طرح ہندو محلوں میں چکر لگا رہے تھے۔ اور بلند آواز سے کہہ رہے تھے کافرو! پڑے رہو بھوکے پیاسے! تم سے بدلہ لیا جائیگا۔ ان بے گناہوں کا جو ہندوستان میں شہید ہوئے۔ کوئی سپاہی بھاری سی گالی بک کر کہتا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں جس کافر نے مکان سے جھانکا بھی اسے گولی سے اڑادونگا۔ اور لوگ اپنے گھروں میں سہمے بیٹھے تھے باہر گلی کوچوں میں ان کی بھینس اور گائیں بھوکی پیاسی دھوپ میں زبانیں نکلے اپنے مالکوں کے

بند دروازوں کو مایوسی سے دیکھ رہی تھیں۔ احساس اور بھوک کے کتے رو رو کر تھک گئے۔ اور تھک کر کونوں کھدروں میں دبکے بیٹھے تھے، اور بلوچ سپاہی چوکوں، چوراہوں میں کھڑے قہقہے لگاتے گالیاں بکتے۔ اور قیدی شہر والوں کو گولی مارنے کی دھمکیاں دیتے، کوئی بھولا بھٹکا آ پھنسا کوئی کوئی اپنے بالاخانے سے باہر کو جھانکتا تو اسے یہ زور دے نیچے بلواتے اور اس سے انسانیت سوز حرکتیں کرتے، اسکے کپڑے تک اتروا لیتے، اور لوگ اپنے تمام دیوتاؤں تمام دیویوں اور تمام رہنماؤں کو پکار پکار کر تھک ہار کر موت کا انتظار کر رہے تھے۔ روپے والے بھاگنے کے منصوبے باندھ رہے تھے۔ اور بعض اس انتظار میں تھے کہ کرفیو کھلتے ہی چاہے ہزار روپے خرچ ہو جائیں۔ ہوائی جہاز کی سیٹ بک کرائیں گے۔

تاجور سامری جب سے دہلی سے لوٹا تھا اپنے ماں باپ پر زور دیتا رہا کہ اب وقت ہے یہاں سے نکل چلو، اگرچہ اسکی ماں اور بھائی تیار تھے لیکن باپ کسی کی نہ سنتا۔ وہ کہتا کانگریس کے نیتا کہتے ہیں گھروں میں ڈٹے رہو۔ تو اب میں بزدلی کیوں دکھاؤں؟ اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ مسلمان ہم پر ظلم کرینگے، پہلے ہم انگریز کے غلام تھے تو اب مسلمانوں کی غلامی سہ لیں گے، یہ کہہ کر وہ اپنے بھنگڑ دل کے اڈے کو سب کو بکتا جھکتا چھوڑ کر چلا جاتا۔ جس مکان میں تاجور سامری رہتا تھا اس میں اور بھی تین خاندان رہتے تھے۔ اس سے پہلے آپس کی بول چال ایک چھوٹی سی بات پر رکی ہوئی تھی لیکن اس مصیبت نے سب کے اختلاف کو ختم کر دیا۔ اور اب سب ملکر رہائی کی تجویزیں سوچتے، پلان بناتے اور آخر جھلا کر ختم کر دیتے۔ اب جب ان کو پتا چلا کہ شہر کا مشہور کانگریسی لیڈر بابو جینت رام تھا، جو سب کو بھروسے سے جمے رہنے کا مشورہ دیتا تھا اور سب کے ساتھ مرنے کی قسمیں کھاتا تھا ایک دن خاموشی سے ٹرک پر بھاگ گیا

کانگریس کا پریزیڈنٹ ترلوک ناتھ ٹھیکیدار بھی ایک ٹرک کا پرمٹ اس وعدے پر ڈپٹی کمشنر صاحب سے حاصل کر چکا تھا کہ کانگریس کے بعض مالی حیثیت سے کمزور کارکنوں کو ہندوستان پہنچائے گا۔ تاجور سامری کے والد سے بھی اسنے کہہ رکھا تھا۔ ایکدن وہ بھی اپنے گھر کے کاٹھ کباڑ کے علاوہ دوسروں کا سامان بھی ٹرک میں بھر شہر سے نو دو گیارہ ہو گیا۔

ایک شام کو تاجور سامری کا والد گھبرایا ہوا گھر آیا۔ کوی پرکاش نے پوچھا، کیا ہوا ہے؟ تو وہ افسردگی سے بولا۔ اب اس شہر میں گزارہ مشکل ہے۔ شہر سے باہر جا نہیں سکتے۔ ریل دروازے کے باہر والا برہمچاری بھی آریہ سکول کیمپ میں چلا گیا ہے۔ اب کیا کریں!

تاجور سامری نے جھلا کر جواب دیا۔ مریں گے اور کیا!

کوی پرکاش نے غصے سے کہا۔ میں نہ کہتا تھا تم ہم سب کو مار دوگے۔ اب بتاؤ جنکے بھروسے اتنے دن بیٹھے رہے وہ کہاں گئے؟

ان کا باپ خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

کوی پرکاش اپنے آپ بولنے لگا۔ یہ سب کچھ برباد کر دے گا۔ تباہ کر دے گا۔ میں کہتا تھا۔ بھائی کا کہنا مان لو۔ اور نکل چلو یہاں سے۔ لیکن اسوقت تو کسی کی بات ماننا توہین سمجھی جاتی تھی۔ بابو رام اچھا رہا۔ وقت پر نکل گیا۔ بلکہ جاتے جاتے وہ سال بھر کے خرچ کا کپڑا بھی ہتھیا لے گیا۔

تاجور سامری نے جل کر کہا اس چور کا ذکر نہ کرو۔ اس سے کسی بھلائی کی اُمید نہیں۔ اور اسکی بیوی دروپدی بھی ایک ہی چڑیل ہے۔ خیر اچھا ہوا دفع ہوئے۔ کمبخت اتنے دن ہمارے ہاں دندناتے رہے اور بھاگنے پر آئے تو اتنا نہ ہو سکا کہ ہمیں جھوٹوں ہی ساتھ چلنے کو کہدیں۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ چاچا رگھا رام آ گئے۔ یہ تاجور سامری کے والد کے لنگوٹیے تھے۔

اس لئے کوی پرکاش اور تاجور سامری ان کو چاچا کہا کرتے تھے۔ یہ سادہ لوح اور مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ آتے ہی بولے اب کیا ہوگا؟ میں تو پچھتاتا ہوں اسوقت کیوں نہ گیا۔ بھئی تمہارا لڑکا ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ بھئی تاجور سامری! بتاؤ اب کیا کریں۔

تاجور سامری نے کہا، "خالصہ کالج اور آریہ سکول میں کیمپ قائم ہو چکے ہیں وہاں چلے جایئے گا۔ اور گاڑیاں اور ٹرک جو چلیں گے!" رکھا رام نے اپنی امید کو ٹوٹنے سے بچاتے ہوئے کہا۔ "چل چلیں گاڑیاں ٹرک اب تو بلوچی سپاہیوں کی گولیاں ہوگی یا پناہگزینوں کے پیچھے اب تو رام رام جپا کرو بیٹے" تاجور سامری یہ کہہ کر باہر کھڑکی میں جھانکنے لگا۔

باتوں کی آواز سنکر پاس سے رام لبھایا اور رام لال بھی آگئے۔ یہ دونوں بھائی تھے۔ چھوٹا رام لبھایا ذرا پڑھا لکھا اور سمجھدار آدمی تھا۔ پچھلی جنگ میں دو سال فوج میں بھی رہ چکا تھا۔ اور بڑا رام لال ایک خاص کردار تھا۔ پرلے درجے کا صندی اور کوتاہ اندیش کام کرنے میں سست لیکن اپنے زعم میں ایسا سمجھتا گویا دنیا بھر کی سیاست کو گھول کر پیئے ہوئے ہے۔ اپنی بات کو رد ہوتے دیکھ کر جھلا جانا اور لڑ پڑنا اس کی فطرت کا خاصہ تھا۔ رام لال جلی ہوئی سگریٹ کو سلگا کر کش لگا کر دھواں چھوڑتے ہوئے بولا، کیا باتیں ہو رہی تھیں، پنڈت جی،

کرپا رام نے افسردگی سے کہا، دنیا کے اس عجیب چکر پر کڑھ رہی ہیں۔

رام لال بولا۔ آپ خواہ مخواہ ناامید ہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں، پاکستان میں ہندوؤں کا کوئی بال بھی اب بیکا نہ کر سکے گا مجھے ایک شخص نے بتایا تھا۔ جناح اور جواہر لال میں ایک خفیہ سمجھوتہ ہو چکا ہے!

رام رکھا خوش ہو کر بولے۔ خوش رہو۔ کیا کہنے پنڈت جی کے۔ میں کہتا تھا ہماری

ضرور سنی جائیگی - کوئی پرکاش نے جل کر کہا - ضرور سنی جائیگی - یہ بلوچی فوج آپ کی پکار سنکر ہی تو آئی ہے - میں کہتا ہوں چاچا اب اس ہوا میں نہ رہو کہ ہندوستان والے آپ کی کوئی مدد کریں گے ان کے لئے آپ کو آج چاہے بلوچی ملٹری بھون کر رکھدے۔

رام لبھایا کانپ کر بولے ۔ بات تو ٹھیک ہی مگر کیا کیا جائے - ریل اور موٹریں تو بند ہو چکیں - اب کیونکر جائیں - ٹرک کا بندوبست ہوسکتا ہی؟

تاجور سامری "طارق آباد کے اوپر سے اڑکر ٹرک گزرے گا۔"

رام رکھا نے حیرت سے کہا! کیا مطلب! زمین پر سرنگیں بچھی ہیں۔

تاجور سامری نے جواب دیا - چاچا، کچھ سوچا کرو، اب سماں رہا ہی ٹرک پر جانے کا ہم اُسی وقت تک زندہ ہیں جبتک بھگائے گئے اور بھڑکے ہوئے مصیبت زدوں کا طوفان ہم سے دُور ہے - اب موت کا ہاتھ ہمارے نزدیک ہی نظر آرہا ہی - طارق آباد سے تو اب کوئی چیز نہیں جاسکتی،

رام لبھایا بولے، اگر میں تو کسی فوجی بھائی سے معاملہ کروں گا!

تاجور سامری "فوجی بھائی اب پہلے مسلمان ہی، سیتا رام صراف کا واقعہ بھول گئے"۔

چاچا رکھا رام کانپ کر بولے، ہے ہے کتنا ظلم ہوا - دن دھاڑے بچارے کو فوجیوں نے اغوا کر لیا - گھر والے اسکے لئے تڑپتے رہے - اور آخر اس کی لاش دکان کے سامنے درخت پر لٹکتی پائی گئی ——— رام رام انرتھ ہو رہا ہی۔

رام لال نے تجویز پیش کی، پھر آریہ سکول کیمپ میں چلے چلیں۔

اس دوران میں عورتیں بھی آچکی تھیں۔

ماسی شاہنی جو رام لال کی بیوی تھی، کہنے لگی - دس روپے ایک ٹرنک کے تانگے والے

مانگتے ہیں۔

چاچا" گویا پچاس روپے میں تانگا۔ ارے یہ ہندو اسوقت بھی بے ایمانی اور ظلم پر کمر باندھے ہوئے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ یہ مصیبت ہم سب پر اکٹھی آئی ہے"

رام لبھایا۔ افسردہ ہوکر کہنے لگا۔ کون سوچتا ہے۔

اتنے میں چاچی بھی آگئیں وہ کہنے لگی۔ کچھ سنا، بھگت رام جا نہ بھی چلا گیا۔

سب حیرانی سے بول اٹھے۔ چلا گیا۔

چاچی اُسی سنجیدگی سے بولی۔ ہاں بنواری لال سیٹھ بھی۔ رام نرائن ورمانی بھی۔ ابھی پڑوس والا رام جوایا مل مجھے بتا کر گیا ہے۔

تاجور سامری نے اب کہنا شروع کیا۔ یہ سب تمہارے ساتھ مرنے کے دعوی باندھتے تھے۔ اور وقت آنے پر بھاگ گئے۔ اب پکارو، بلاؤ۔ اپنے لیڈروں اور سیٹھوں کو، چاچا اگر تم لوگ مسلمانوں کے دلکو جیتنے کی کوشش کرتے تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔

چاچا رکھا رام آہ بھر کر کہنے لگے۔ بھگوان ان سے سمجھے گا۔

کوی پرکاش بھڑک کر بولا۔ کون بھگوان، کیا یہ مندروں میں گڑا ہوا پتھروں کا بُت، جو اپنی مرضی سے حرکت بھی نہیں کر سکتا۔ ان دیوتاؤں کا انجام آپ لوگ جلد ہی سن لینگے یہ پاکھنڈ بھی اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ جوالا نگر والے مندر کی بربادی تو آپ سُن ہی چکے ہیں۔ گوپی ناتھ کا۔ پجاری بھی ہندوستان بھاگ گیا، بھگوان نے پاکستان کو چھوڑ دیا، اپنے مندر کو چھوڑ دیا، آپ کو یاد ہے گوپی ناتھ کا مندر وہی مندر ہے جہاں پچھلے سال اچھوتوں کے داخلے پر بڑا واویلا مچایا گیا تھا۔ اچھوتوں کے چلے جانے کے بعد سارے مندر کے فرش کو گنگا جل سے پوتر کیا گیا تھا۔ اور آج، آپ دیکھتے ہیں ٹھاکروں کے استھان پر کتے بیٹھے نظر